خوانِ خلیلؒ

تالیف

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

۱۲۸۰ - ۱۳۶۲ھ

۱۸۶۳ - ۱۹۴۳ء

البشریٰ

ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ

100

خوانِ خلیلؑ

تالیف

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

۱۲۸۰ - ۱۳۶۲ھ
۱۸۶۳ - ۱۹۴۳ء

البشریٰ

ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ رجسٹرڈ

تمہید طبع خوانِ خلیل

از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس اللہ سرہٗ

بسم اللّٰه الرحمن الرحیم

نحمده و نصلي على رسوله الكريم

اس ناکارہ کو ہمیشہ اپنے اکابر کے حالات کے سننے اور جمع کرنے کا، سوانح لکھوانے کا بہت ہی اشتیاق رہا، ''تذکرۃ الخلیل'' میں جیسا کہ خود مولانا مرحوم نے بھی تحریر فرمایا اس ناکارہ کے اصرار کو بہت دخل تھا، اسی طرح حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہ، چچا جان قدس اللہ سرہٗ، عزیز مولوی یوسف نور اللہ مرقدہٗ کی سوانحوں کی تالیف میں اس ناکارہ کا بہت دخل رہا، مگر افسوس کہ ''تذکرۃ الرشید'' یعنی سوانح قطب العالم حضرت اقدس گنگوہی اور ''تذکرۃ الخلیل'' جس میں میرے پانچ اکابر کے مختصر حالات ہیں، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہ جو ان دونوں کتابوں کے مصنّف تھے ان کے انتقال کے بعد سے ان دونوں کتابوں کی طباعت کا سلسلہ بند ہوگیا۔

ہر چند میں نے مولانا مرحوم کے صاحب زادگان پر اصرار کیا اور تقاضے کیے کہ یہ جواہر پارے، اسی طرح مولانا کی دیگر تصانیف علمی ودینی ذخیرے کے ساتھ ساتھ بہت ہی مقبول عام کتابیں ہیں، مگر ان عزیزوں کو دوسرے قصوں کی وجہ سے ان کی طرف توجہ نہ ہوئی، بالآخر ''تذکرۃ الخلیل'' تو میں نے گذشتہ سال عزیزم مولوی حکیم محمد الیاس سلمہ پر تقاضا کرکے طبع کرائی تھی، اور اس سے پہلے جناب الحاج متین احمد صاحب سے بھی کئی سال سے تقاضا کر رہا تھا اور وہ اس کا اہتمام بھی کر رہے تھے، مگر حالات کی ناسازگاری سے طبع نہ ہوسکی، لیکن بحمد اللہ گذشتہ سال وہ بھی طبع ہوکر شائع ہوچکی، لیکن ہند و پاک میں کتابوں کی آمد و رفت بند ہے اور حکیم الیاس صاحب کی مطبوعہ قریب الختم ہے، اس لیے میں نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اس

کے ساتھ ''خوانِ خلیل'' جو حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی صاحب قدس سرہ نے حضرت سہارن پوری کے وصال پر ایک مختصر سا رسالہ تالیف فرمایا تھا وہ بھی بطورِ ضمیمہ کے شائع کر دیا جائے، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کہ دو ہفتے مختلف احباب کو اس کے ڈھونڈنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑی اور بڑی مشکل سے ملی۔

اس کے سننے سے یہ معلوم ہوا کہ اس میں تو حضرت حکیم الامت نے کوزہ میں دریا کو بند کر رکھا ہے اور نہایت اختصار کے ساتھ جام میں اپنی دوسری تالیفات کا حوالہ فرما دیا، اس لیے میں نے ''خوانِ خلیل'' کو سنتے وقت ان حوالہ جات کو بھی تلاش کرایا اور ان میں سے جو عام فہم اور محتاج الیہ تھے ان کو تو بطورِ ضمائم کے اس پر نقل کرا دیا، اور جو بہت طویل مضمون تھے جیسا کہ ایک مضمون خواب کے سلسلہ میں مختصر طور سے تو یہاں بھی آیا اور اس کے متعلق مختصر مضمون ضمیمہ میں بھی لکھوایا، لیکن اس کے متعلق مختلف علما کے فتاویٰ ''الامداد'' بابت ماہ شوال، ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ کے تریسٹھ صفحات پر تھے وہ تو گویا مستقل ایک کتاب تھی، اسی طرح بعض علمی وفقہی مسائل تھے جو عام فہم نہ تھے اس لیے ان کا مفصّل حوالہ لکھوا دیا۔

اس سب کے بعد دوستوں کا اصرار ہوا اور مجھے بھی اچھا معلوم ہوا کہ ''خوانِ خلیل'' کو مستقل بھی چھاپ دیا جائے اور ''تذکرۃ الخلیل'' کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر بھی چھاپ دیا جائے۔ اس لیے کہ میرے شیخ کے حالات اور حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے قلم سے نور علی نور ہیں، اس لیے آج ۲۲؍ ذی قعدہ ۹۱ھ کو اس کے ضمائم پورے ہونے کے بعد توکلاً علی اللہ طباعت کے لیے دے رہا ہوں۔

وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت وإليه أنيب.

(حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا)

مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور (یو، پی)

خوانِ خلیل

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

بعد الحمد والصلاۃ:

حضرت مولانا عارف جامی رحمۃ اللہ علیہ نے مشتریانِ یوسف علیہ السلام کے قصّے میں نقل فرمایا ہے:

چو یوسف شد بخوبی گرم بازار
شدندش مصریاں یکسر خریدار
بہر چیزے کہ ہرکس دسترس داشت
دراں بازار بیع او ہوس داشت
شنیدم کز غمش زالے برآشفت
تنیدہ ریسمانے چند ومی گفت
ہمیں بس گرچہ من کاسد قماشم
کہ در سلک خریدارانش باشم

اسی مخلص بڑھیا کی تقلید ان سطور کی تحریر میں احقر نے اختیار کی ہے کہ ایک حبرِ ہمام وبحرِ قمقام یعنی:

الشيخ مولانا خليل أحمدا
مكسو حلة خلة الرحمن
وسمي إبراهيم يوسف وقته
من وجهه كالقلب في اللمعان [1]

المتوفى في ربيع الثاني ١٣٤٦ ھ رحمه اللّٰه تعالى رحمة واسعة وأفاض من بركاته على أهل الديار القريبة والشاسعة.

[1] ضمیمہ: ۱/۲۵۔

کے دریائے کمالات میں سے چند رشحات وقطرات ناظرین مشتاقین کے قلوب وابصار پر بصورتِ رسالہ پاشاں کرتا ہوں جو بمقابلہ اس دریا کے امواج کے (جن کو مولانا قدس سرہٗ کے حذاق عارفین معرفین عنقریب سطحِ اذہانِ عشاق معتقدین صادقین پر متلاطم ومتراکم فرمائیں گے) وہی نسبت رکھتے ہیں جو اس بڑھیا کا ریسمان خزائن عزیز سے نسبت رکھتا تھا جس کے پیش کرنے میں میری بھی وہی نیت ہے جو اس بڑھیا کی تھی یعنی:

ہمیں بس گرچہ من کاسد قماشم
کہ در سلک خریدارانش باشم

جیسا اس کے قبل اسی نمونہ کی دو مختصر یادداشتیں ''یادِ یاراں'' و''ذکرِ محمود''[1] پیش کرچکا ہوں اور یہ ماحضر نافع ہونے کی صورت میں چوں کہ مولانا ہی کا فیض ہوگا، اس لیے ممدوح کو حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اور ان فیوض کی مبدأیت کو آپ کی شانِ میزبانی سے تشبیہ دے کر ان فیوض کے مجموعہ کو خوان کے اور اس کے آحاد کو جاماتِ اطعمہ[2] واشربہ کے مشابہ قرار دے کر اس مجموعہ حالات کو ''خوانِ خلیل'' سے اور ہر جز کو ''جام'' سے ملقّب کرتا ہوں، اور ان ہی مناسبات سے اس رسالہ کی لوح پر اس شعر کے لکھنے کا مشورہ دیتا ہوں:

گر شوی در دین مہمانِ خلیل
جامہا نوشی ازیں خوانِ خلیل

اب وہ جامات پیش کرتا ہوں، واللہ یطعم ویسقي وھو یشبع ویروي.

کتبہ اشرف علی عفی عنہ اوائل رجب ١٣٤٦ھ

جام نمبر ١: یوں تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے اس احقر کو مدتِ دراز سے نیاز حاصل تھا، لیکن زیادہ خصوصیت اس زمانہ سے ہوئی جب سے میں کان پور کا تعلّق چھوڑ کر وطن[3] میں مقیم ہوا اور سہارن پور کی آمد ورفت میں کثرت ہوئی، جس میں مظاہرِ علوم کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تو

---

[1] ضمیمہ: ٢/٢٥۔ [2] في القاموس، جام: إناء من فضة، ج: جامات، انتھی، وھو یعم ما للمأکول وما للمشروب. [3] ضمیمہ: ٣/٢٥۔

گویا بالالتزام حاضری ہوتی تھی اور متفرق طور پر بھی بکثرت آنا جانا رہتا تھا اور ہر حاضری میں طویل طویل اوقات مولانا کی صحبت سے مستفید رہتا تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ باوجودیکہ میں ہر طرح چھوٹا تھا عمر[1] میں بھی، طبقہ[2] میں بھی اور علم وعمل میں تو مجھ کو کوئی نسبت ہی نہ تھی، اس میں تو چھوٹے بڑے ہونے کی نسبت کا ذکر بھی ایک درجہ میں ادّعا ہے علم وعمل کا، مگر مولانا کا برتاؤ مساویانہ تو یقینی ہی تھا، بعض اوقات ایسا برتاؤ فرماتے تھے کہ جیسے چھوٹے کرتے ہیں بڑوں کے ساتھ، اس سے زیادہ کیا درجہ ہوگا تواضع کا، یہ بنا تو یقینی تھی اور احتمالی یہ بھی ہے کہ شاید اس واقعہ کو بھی دخل ہو کہ مولانا[3] بواسطہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ سے منتسب تھے اور یہ احقر بلاواسطہ،[4] اگر یہ بھی تھا تو اس حفظِ مراتب کا جو کہ حکمتِ عملیہ کا اعلیٰ شعبہ ہے کامل ثبوت ہوتا ہے۔

فائدہ: تواضع وحفظِ حدود کا کمالاتِ مقصودہ میں سے ہونا ظاہر ہے۔

جام نمبر۲: مولانا نے اپنے ایک معتقدِ خاص سے فرمایا تھا کہ مجھ کو اشرف سے اس وقت سے محبّت ہے جس وقت اس کو خبر بھی نہ تھی۔

فائدہ: اس واقعہ میں ایک خاص سنت کا اتباع ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر کسی کو کسی سے محبّت ہے تو اس کو خبر کردے، انتھی، اور حکمت اس کی ظاہر ہے کہ اس میں تطییب ہے قلبِ مسلم کی، نیز جلب ہے اس کی محبّت کا اور باہمی تحابب وتوادد کے ثمرات ظاہر ہیں۔

جام نمبر۳: باوجود میرے کم مرتبہ ہونے کے گاہ گاہ مجھ کو ہدایا سے بھی مشرف فرمایا ہے۔

---

[1] حضرت سہارن پوری کی ولادت صفر ۱۲۶۹ھ اور حضرت حکیم الامت کی ولادت ۵ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ چہارم شنبہ بوقت صبح صادق ہے۔ ومما ينبغي أن يحفظ حضرت سہارن پوری کی وفات ۱۵ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ بالمدینہ منورہ اور حضرت تھانوی کی وفات ۱۶رجب ۶۲ھ شب سہ شنبہ ساڑھے دس بجے ہوئی۔

[2] حضرت سہارن پوری کی اجازتِ بیعت از حضرت شیخ المشائخ حاجی صاحب محرم ۱۲۹۸ھ اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی اجازت شیخ المشائخ مہاجر مکی سے شروع ۱۳۱۱ھ میں ہے، جیسا کہ بتفصیل ضمیمہ: ۴، ۵ ہے۔

[3] ضمیمہ: ۴/۲۶۔ [4] ضمیمہ: ۵/۲۶۔

فائدہ: اس میں علاوہ سنتِ تہادی کے کہ سبب ہے تحابب مطلوب کا، تواضع بدرجۂ غایت بھی ہے، کیوں کہ تہادی بشانِ خاص تواضع ہی سے ناشی ہے۔

جام نمبر ۴: احقر مولانا کے سامنے وعظ کہتا ہوا بے حد شرماتا تھا گو امتثالِ امر کے سبب عذر نہ کرسکتا تھا، لیکن مولانا نہایت شوق و رغبت سے استماع فرماتے تھے۔

فائدہ: اس میں علاوہ تواضع کے اہتمامِ علم کے فضائل کی بھی تحصیل ہے جس پر سلفِ صالح عامل تھے۔

جام نمبر ۵: ایک بار احقر کے مواعظ کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ اس کے بیان میں کہیں انگلی رکھنے تک کی گنجائش نہیں۔

فائدہ: اس میں حسن ظن وسنت مدح لتالیف القلب وتحضیض علی الخیر کا ثبوت ظاہر ہے۔

جام نمبر ۶: گاہ گاہ غریب خانہ کو بھی اپنے اقدام سے مشرف فرماتے تھے۔ مجھ کو یاد[1] ہے کہ غالباً جب اول بار تشریف آوری ہوئی تو احقر نے جوشِ محبت میں کھانے میں کسی قدر تکلّف بھی کیا۔ اور اہلِ قصبہ میں سے بھی بعض عمائد کو مدعو کردیا کہ عرفاً یہ بھی معزز ضیف کا اکرام ہے (ان بعض عمائد نے میری اس خدمت کا یہ حق ادا کیا کہ بعد جلسۂ دعوت کے مجھ کو بدنام کیا کہ طالبِ علم ہو کر اتنا تکلّف کیا؟ پانچ چھ کھانے والوں کے سامنے بہتر یا باسٹھ برتن تھے، میں عدد بھول گیا کہ کون سا فرمایا تھا۔ اس روایت کے قبل مجھ کو تکلّف کے مقدار کی طرف التفات بھی نہ ہوا تھا) مولانا نے مزاحاً فرمایا کہ یہ تکلّف کیوں کیا گیا؟ میں نے عرض کیا کہ اس کا سبب خود حضرت ہی ہیں، اگر بکثرت کرم فرماتے تو ہرگز تکلّف نہ کرتا، یہ تقلیل سبب ہے اس تکثیر کا، اس کے بعد آمد کی تکثیر ہوگئی اور تکلّف کی تقلیل۔

فائدہ: اس سے بے تکلفی وسادگی ورعایتِ میزبان ظاہر ہے اور ان سب کا اخلاقِ فاضلہ سے ہونا ظاہر ہے۔

---

[1] ضمیمہ: ۶/۲۹۔

جام نمبر ۷: باوجود یہ کہ اس احقر کے ساتھ مساویانہ بلکہ اس سے بھی زیادہ تر برتاؤ فرماتے تھے جیسا کہ جام نمبر ۱ میں مذکور ہوا، لیکن اظہارِ حق کا اس قدر غلبہ تھا کہ اگر میں نے استفادتًا کوئی بات پوچھی تو اس کے جواب میں کبھی تکلّف نہیں فرمایا اور کبھی از خود بھی متنبہ فرمایا، چناں چہ اس وقت تین مسئلے اس قسم کے میرے ذہن میں حاضر ہیں:

مسئلہ: میرا ایک دوست سے اس مسئلے میں اختلاف ہوا کہ پشت کی طرف سے فوٹو لینے میں جس میں چہرہ نہ آوے گنجائش ہے یا نہیں؟ جانبین سے مکاتبت کا سلسلہ چلتا رہا، آخر میں احقر نے اس دوست کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے فیصلے پر راضی کر کے تحقیقِ مسئلہ کی درخواست کی، مولانا نے خوشی سے قبول فرما کر مسئلے کا فیصلہ کر دیا، چناں چہ ہم دونوں نے قبول کر لیا۔ یہ محاکمہ [1] تتمہ جلدِ رابع ''فتاویٰ امدادیہ'' کے آخر میں شائع ہو چکا ہے، اس محاکمہ کی تمہید میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت قابلِ دید ہے وهي هذه: بندہ ناچیز باعتبار اپنے علم وفہم کے اس قابل نہیں کہ علمائے اعلام کے اختلاف کا فیصلہ کر سکے، مگر ہاں! امتثالاً للأمر الشریف اس مسئلہ میں جو کچھ خیال میں آیا عرض کرتا ہے إلخ

فائدہ: تواضع اور اظہارِ حق میں اس طرح جمع کرنا جس درجہ کا کمال ہے ظاہر ہے۔

مسئلہ ۲: مشتمل بر سوالاتِ متعددہ، جزوِ اول: بعض روایات میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے وارد ہے أخطأ الكاتب في ''تستأنسوا'' وإنما هو ''تستأذنوا''. میں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بذریعۂ خط پوچھا جس کا جواب نہایت [2] قریب وعجیب ارشاد فرمایا جو ''بیان القرآن'' کے حواشیٔ عربیہ متعلقہ آیت ﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ﴾ [3] الآیۃ میں شائع ہوا ہے۔ احقر نے اس خط کو مختصر اور معرب کر دیا ہے، جس کا حاصل بر تقدیرِ ثبوت ایسی قرأت کا قرأتِ موجودہ سے منسوخ ہونا اور راوی کو نسخ کی خبر نہ پہونچنا ہے انتھی۔ جزوِ ثانی: متعلقِ نبوت، جزوِ ثالث: متعلقِ رقومِ مدرسہ، جزوِ رابع: متعلقِ عدت، یہ سب اجزا بعینہا

[1] برضمیمہ: ۲۹/۷۔ [2] برضمیمہ: ۳۰/۶۔ [3] نور: ۲۷۔

''فتاوی امدادیہ'' جلد چہارم کے آخر میں بعنوان ''بعضے از تحریرات اِلخ''[١] شائع ہوئے ہیں۔

مسئلہ: پیر محمد والی مسجد کی سمت جنوب میں جو سہ دری مسجد سے ملی ہوئی ہے اس پر سائبان ڈالا گیا تو مولانا نے اس کے متعلق از خود کچھ تحریر فرمایا جس کا یہاں سے جواب عرض کیا گیا۔ چند بار اس میں مکاتبت ہوئی جس میں کوئی اخیر فیصلہ نہیں ہوا۔ اس مکاتبت کا نام مسئلة أهل الخلة في مسئلة الظلة ہے، جو ''ترجیح الراجح''[٢] کے حصّہ دوم کے اخیر کے قریب میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مکتوب سوم کے شروع میں ایک عجیب دل ربا جملہ ہے وهي هذه:

گرامی نامہ موجبِ برکت ہوا، کئی روز تک تو یہ خیال رہا کہ مسئلہ کے متعلق کچھ عرض کروں یا نہ کروں، مبادا تکرار موجبِ بار ہو بالآخر یہ خیال ہوا کہ اپنا خیال ایک دفعہ اور عرض کردوں اِلخ

ملاحظہ فرمایا جاوے اس جملہ میں رعایتِ حق و رعایتِ خاطر دونوں کو کس طرح جمع فرمایا گیا ہے، اس کا اثر احقر پر یہ ہوا کہ اس پر جو عرض کیا گیا باوجود یہ کہ اس کا جواب نہیں آیا، مگر مجھ کو ایک تنبیہ میں اس کو لکھنے کی ضرورت ہوئی کہ اس کا جواب نہ آنے کو حجّت نہ سمجھا جاوے إلی قولي: اس باب میں اہلِ علم سے مزید تحقیق کرلی جاوے۔

جام نمبر ٨: ایک بار بعض عنایت فرماؤں نے بعض حکایات کی نسبت میری طرف خلافِ واقع کردی جس کا چرچا اپنے مجمع میں پھیل گیا۔ میں اس وقت میرٹھ میں تھا اور اس چرچے سے بالکل غافل۔ مجھ کو خیر خواہ دل سوز نے یہ خبر پہنچائی، مجھ کو بہت رنج ہوا اور سب سے زیادہ خیال مجھ کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے تکدر کا تھا، اس لیے میں نے اس واقعہ کی حقیقت مولانا کی خدمت میں لکھ بھیجی، وہاں سے حسبِ ذیل جواب آیا: معلوم نہیں لوگوں کو کیا مزا آتا ہے کہ غلط روایتیں پہنچا کر اہلِ خیر کے قلوب کو دکھاتے ہیں، مجھ ناچیز کو جو تعلّق اور محبّت پہلے تھا وہی عقیدت بحمد اللہ موجود ہے:

آں نیست کہ حافظ را مہرت رود از خاطر
آں وعدۂ پیشینش تا روز پسیں باشد

جو قلبی محبّت اور جس کو ذخیرۂ آخرت سمجھ رکھا ہو وہ ان شاء اللّٰہ تعالیٰ بدل نہیں سکتی جو

---

[١] بر ضمیمہ: ٩/٣١۔ [٢] بر ضمیمہ: ١٠/٣٣۔

روایتیں پہنچی ہیں ان میں مبالغہ سے بہت کام لیا گیا ہے، انتھی ملخصا بقدر الضرورۃ

یہ واقعہ ''حکایات الشکایات''[1] حکایت نمبر: ۴ کے آخر میں مذکور ہے۔ بعد اختتامِ قصہ کے مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ اس دل سوز خیر خواہ کے ذریعہ سے بدون اپنی طرف نسبت کرنے کے، میں نے ہی یہ خبر پہنچائی تھی، تاکہ تاخیرِ تدارک سے بات بڑھ نہ جائے۔

فائدہ: اس سے مولانا کی کتنی بڑی خیر خواہی ثابت ہوتی ہے کہ میری بے خبری کو صعوبتِ تدارک کی مصلحت سے گوارا نہیں فرمایا، اور اپنی طرف منسوب نہ فرمانا ممکن ہے کہ اس لیے ہو کہ زیادہ رنج نہ ہو، کیوں کہ راوی جس قدر زیادہ ثقہ ہوتا ہے اسی قدر روایت کا زیادہ اثر ہوتا ہے، واللّٰہ أعلم بضمائر عبادہ۔

جام نمبر ۹: ایک شخص نے اپنی ایک حالت کی جس کا کچھ حصہ نوم تھا اور کچھ یقظہ مشابہ بنوم تھا اور اس حالت میں غیر اختیاری طور پر ایک غیر مشروع کلمے کا زبان سے نکلنے کی اطلاع دے کر تحقیق چاہی تھی، میں نے قواعدِ شریعت وطریقت سے اس کا جواب لکھ دیا، جس کا حاصل سائل کا معذور ہونا تھا۔ چوں کہ طریقت اس وقت کالمہجور ہوگئی ہے اس لیے اس جواب کی حقیقت نہ سمجھنے سے اکثر عوام اور بعض اہلِ علم میں بھی اس کے متعلق ایک شورش[2] برپا ہوگئی کہ اس کو معذور کیوں قرار دیا؟ جس کی تحقیق احقر نے ''حکایات الشکایات''[3] کی حکایت سوم میں لکھی ہے۔ مولانا نے شفقت سے زبانی مشورہ دیا کہ اس سائل کے قابلِ توبیخ ہونے کے متعلق کوئی تحریر شائع ہو جائے تو شورش کم ہو جائے اور عوام کا دین بھی محفوظ رہے، انتھی بمعناہ.

میں نے اس باب میں اپنا شرح صدر نہ ہونا عذر میں پیش کیا اور عرض کیا کہ آپ اور دوسرے علما کچھ تحریر فرماویں تو میں شائع کردوں، اس کو منظور فرمایا۔ چناں چہ میں نے سوال مرتب کر کے مختلف علما سے رجوع کیا جس میں مولانا بھی تھے، سب نے اپنی اپنی رائے کے موافق جواب لکھا جو ''الامداد''[4] شوال ۱۳۳۶ھ میں شائع ہوئے ہیں۔

---

[1] برضمیمہ: ۳۵/ ۱۱۔ [2] اس زمانے میں اخبارات واشتہارات میں اس پر بڑا ہنگامہ اور غوغا قائم تھا۔
[3] برضمیمہ: ۴۵/ ۱۲۔ [4] برضمیمہ: ۵۴/ ۱۳۔

فائدہ: اس میں بھی وہی خیر خواہی اور اس کے ساتھ دین کی حفاظت کا اہتمام ظاہر ہے۔

جام نمبر ۱۰: اس قصۂ مذکورہ کا اثر عوام میں کسی قدر باقی تھا کہ اس اثنا میں مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے جلسۂ سالانہ کا موقع آ گیا، حسبِ دستور میں بھی حاضر ہوا، چوں کہ اس جلسے میں احقر کا معمول وعظ بیان کرنے کا تھا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بمصلحۃ براءۃ عن التہمۃ مجھ سے فرمایا کہ اس وقت بڑا مجمع موجود ہے۔ اگر اس واقعۂ خواب کے متعلق کچھ بیان کر دیا جائے تو اچھا ہے، تا کہ عوام کے شکوک رفع ہو جاویں۔ احقر نے عرض کیا کہ مجھ کو تو اس کے متعلق کچھ بیان کرنے سے شرم و عار آتی ہے کیوں کہ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ میں اپنا تبریہ کروں اور انسان اپنا تبریہ ایسی بات سے کیا کرتا ہے جس کا کسی درجے میں احتمال ہو، پس تبریہ کرنا اس کے احتمال کو تسلیم کر لینا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اچھا! اگر تم اپنی زبان سے تبریہ نہیں کرتے تو ہم میں سے کوئی شخص اس کے متعلق بیان کر دے۔ احقر نے عرض کیا کہ اگر ایسا ہوا تو میں جلسے سے اٹھ جاؤں گا۔ مولانا نے فرمایا: نہیں نہیں! تم کو گوارا نہیں تو پھر کوئی ضرورت نہیں، یہ سب مکالمۂ وعظ ''مظاہر الاقوال''[۱] کی تمہید میں مذکور ہے۔ اس مشورہ میں بھی علاوہ خیر خواہی کے اتباعِ سنت یعنی تہمت کا رفع کرنا ہے۔ جیسا حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے واقعۂ اعتکاف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مگر یہ مشورہ چوں کہ محلِ اجتہاد تھا جس کی وجہ احقر کے جواب میں مذکور ہو چکی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سنت اس امر میں ہے جو محلِ اشتباہ ہو، جب یہ نہیں تو احتمالات غیر ناشی کا کہاں تک انسداد کیا جاوے۔ یوں تو جواب دینے کے بعد بھی اس میں پھر شبہات پیدا کیے جا سکتے ہیں تو پھر اس کے لیے تو ایک محکمہ کی ضرورت ہوگی یہ توجیہ ہے میرے جواب کی، مگر میرے اس عذر کے قبول فرما لینے کے بعد جب بیان ہوا تو اتفاق سے حفظِ لسان و مذمتِ بہتان کا، چناں چہ اس وعظ کے ملاحظہ سے ظاہر ہوگا جس سے بلا اختیار مولانا اور بدون قصد احقر کے ایک کرامت مولانا کی ظاہر ہوئی کہ جس چیز کو مولانا کا جی چاہتا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کو واقع فرما دیا۔

---

[۱] بر ضمیمہ: ۱۴/۵۵۔

اسی کو عارف رومی فرماتے ہیں:

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد یزداں مرادِ متقیں

جام نمبر ۱۱: ایک تقریب غسل صحتِ ختنہ میں اتفاق سے یہاں سے احقر اور سہارن پور سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور دیوبند سے حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک قصبہ میں مجتمع ہو گئے، مگر بعض عوارض کے سبب میں تو بلا شرکت واپس آگیا اور دیگر حضرات نے ان عوارض کی طرف التفات نہیں فرمایا اور شرکت فرمالی، اس کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اس کی وجہ پوچھی، کیسا تواضع کا جواب ارشاد فرمایا کہ ہم نے فتوے پر عمل کیا اور فلاں شخص (یعنی احقر) نے تقوے پر عمل کیا۔[1]

فائدہ: اس جواب سے جس قدر تواضع اور اختلافی امر میں شقِ مقابل کے اختیار کرنے والے کے عمل کی حسنِ توجیہ مرعی ہے ظاہر ہے اور حضرت مولانا دیوبندی نے جو جواب عطا فرمایا وہ رسالہ ذکرِ محمود نمبر: ۲۴ میں مع تفصیلِ قصّہ مذکور ہے۔

جام نمبر ۱۲: مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں حضرات سلف کی سی تواضع تھی کہ مسائل واشکالاتِ علمیّہ میں اپنے چھوٹوں سے بھی مشورہ فرماتے تھے اور چھوٹوں کے معروضات کو شرحِ صدر کے بعد قبول فرما لیتے تھے، چناں چہ بعض واقعات نمونہ کے طور پر معروض ہیں:

واقعہ نمبر ۱: ایک بار سفرِ بہاول پور[2] میں اس احقر سے ارشاد فرمایا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبولِ ہدایا کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ پہلے سے اشرافِ نفس نہ ہو، مگر سفر میں اکثر داعی کی عادت ہوتی ہے کہ مدعو کو کچھ ہدیہ دیتے ہیں، اس عادت کے سبب اکثر خطور بھی ایسے ہدایا کا ذہن میں ہو جاتا ہے۔ سو کیا خطور بھی اشرافِ نفس وانتظار میں داخل ہے جس کے بعد ہدیہ لینا خلافِ سنت ہے؟ اس حقیر میں کیا قابلیت تھی کہ ایسے عظیم الشان عالم اور عارف کے

[1] برضمیمہ: ۵۶/ ۱۵۔ [2] برضمیمہ: ۵۹/ ۱۶۔

استفسار کا جواب دے سکوں، لیکن چوں کہ لہجۂ استفسار أمر بالجواب پر دال تھا، اس لیے الأمر فوق الأدب کے بنا پر جواب عرض کرنا ضروری تھا، چناں چہ میں نے عرض کیا کہ میرے خیال میں اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ اس احتمال کے بعد دیکھا جاوے کہ اگر وہ احتمال واقع نہ ہوتو آیا نفس میں کچھ ناگواری پیدا ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر ناگواری ہوتو اس احتمال کا خطور اشرافِ نفس ہے، اور اگر ناگواری نہ ہوتو اشرافِ نفس نہیں ہے خالی خطرہ ہے جو احکام میں مؤثر نہیں، اس جواب کو بہت پسند فرمایا اور دعا دی۔

فائدہ: اس واقعہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے چند کمالات ثابت ہوتے ہیں، ایک: تواضع جس کے سلسلہ میں یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے: دقیق تقوی کہ اشراف کے احتمالِ بعید تک نظر پہنچی اور اس پر عمل کا اہتمام ہوا۔ تیسرے: اتباعِ سنت جیسا کہ ظاہر ہے۔ چوتھے: اپنے معاملہ میں اپنے نفس کو متہم سمجھا کہ اپنی رائے پر وثوق نہیں فرمایا ورنہ جس کی نظر اتنی دقیق ہو کیا اس فیصلے تک وہ نظر نہیں پہنچ سکتی تھی؟

واقعہ نمبر۲: ایک بار خود افادتاً فرمایا اور زیادہ یاد یہ پڑتا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی سے نقل فرمایا تھا کہ قرآن مجید میں جو اوقاف لازمہ ہیں وہ ایسے ہی مواقع پر ہیں جہاں وصل کرنے سے ایہام خلافِ مقصود کا ہوتا ہے، چناں چہ ظاہر ہے، مگر اس آیت میں کفار کا قول منقول ہے: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ﴾ اور وَلَدًا پر وقف نہیں، حالاں کہ قاعدۂ مذکورہ کا مقتضا یہاں پر لزومِ وقف تھا، کیوں کہ وقف نہ ہونے سے ایہام ہوتا ہے کہ سبحانہ بھی ان ہی قائلین کا قول ہے، حالاں کہ یہ ان کے قول ﴿اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ کا رد اور ابطال ہے۔ سو اس میں نکتہ یہ ہے کہ تنزیہ میں جہاں تک ہو تعجیل کی جائے تالی یا سامع کو نافیینِ تنزیہ کے قول کے بعد ذرا بھی انتظار نہ ہو کہ اس قول کے متعلق کیا فیصلہ فرمایا گیا ہے، انتھی بمعناہ.

باوجود یہ کہ خود یہ نکتہ ارشاد فرمایا، مگر ایسے ہی ایک مقام کے متعلق (جس کی تعیین مجھ کو یاد نہیں رہی) احقر سے فرمایا کہ "یہاں دفعِ ایہام کے لیے وقف ہونا لازم تھا، مگر ائمۂ وقف نے یہاں وقف کا حکم نہیں فرمایا"۔ مجھ کو وہ نکتہ یاد آگیا، میں نے عرض کیا کہ ایک بار آپ نے یہ

نکتہ فرمایا تھا، یہاں بھی وہی نکتۂ تعجیل ابطالِ باطل ہوسکتا ہے۔

فائدہ: علاوہ تواضع کے اس احتیاطِ بلیغ کو ملاحظہ فرمایا جاوے کہ باوجود یہ کہ اس نکتہ پر نظر تھی، مگر خصوصیّتِ مقام کے سبب دوسرے سے مشورہ فرمایا کہ شاید یہاں کوئی دوسرا داعی ہو۔ علمائے رسوم ایسی احتیاطیں کہاں کرتے ہیں، یہ اہلِ حقائق ہی کا حصّہ ہے۔

فائدہ: اس نکتۂ مذکورہ کے علاوہ احقر کے ذہن میں ایسے مقامات کے متعلق ایک اور حقیقت آئی ہے۔ بنظر علما کی نظر ثانی کے عرض کرتا ہوں کہ ایہام کے مواقع تتبع سے دو قسم کے معلوم ہوئے ہیں، ایک: وہ کہ اہلِ حق کی طرف انتسابِ باطل کا ایہام ہو، دوسرے: وہ اہلِ باطل کی طرف انتسابِ حق کا ایہام ہو۔ سو اول قسم کے مواقع میں تو وقفِ لازم کلی ہے اور دوسرے قسم کے مواقع میں وقفِ لازم اکثری ہے۔ علمائے وقف نے ایسے مواقع پر اس کا زیادہ اہتمام والتزام نہیں کیا، جس کا مبنی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اہلِ حق سے تو صدور باطل کا منکر شرعی ہے تو اس ایہام کا دفع زیادہ مہتم بالشان ہے، اور اہلِ باطل سے صدورِ حق کا منکر شرعی نہیں "لأن الكذوب قد يصدق" بلکہ یہ صدور خود قرآن میں منقول ہے، جہاں منافقین کا ذکر ہے، چناں چہ دوسرے قسم کے بعض مواقع کا ذکر کرتا ہوں جس سے میرا دعویٰ اکثریت کا ثابت ہوتا ہے: سورۂ منافقون کی اول آیت میں منافقین کا قول: ﴿نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ﴾[1] منقول ہے اور یہاں علما نے وقف لازم کیا ہے، تاکہ اس کے بعد کا قول: والله يعلم إلخ کی نسبت ان کی طرف متوہم نہ ہو تو یہاں تو ایہام کا اعتبار کیا گیا اور اسی سورت میں رکوع اول کے ختم کے قریب منافقین کا قول ﴿لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا﴾[2] منقول ہے اور اس کے متصل ہی اس کا رد ﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ﴾ إلخ منقول ہے جو حق تعالیٰ کا قول ہے، مگر ينفضوا پر وقف لازم نہیں تو یہاں اس ایہام کا اعتبار نہیں کیا گیا، اسی طرح اسی کے بعد ان کا دوسرا قول منقول ہے ﴿لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ﴾[3] اور اس کے متصل ہی اس کا رد وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ إلخ منقول

[1] منافقون: ۱ [2] منافقون: ۷ [3] منافقون: ۸

ہے جو حق تعالیٰ کا قول ہے، مگر اَلْاَذَلَّ پر وقف لازم نہیں تو یہاں بھی اس ایہام کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ پس ثابت ہوا کہ ایہامِ ثانی کا اعتبار اکثری ہے کلی نہیں، سو اسی بنا پر **ولدا** پر وقف لازم نہ ہونے کو بھی مبنی کر سکتے ہیں، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ

واقعہ نمبر ٣: ایک شخص نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے روبرو ایک حکایت بیان کی کہ ایک شخص مرگیا تھا تھوڑی دیر میں وہ زندہ ہوگیا اور اسی نام کا ایک دوسرا شخص اسی وقت مرگیا اور پہلے مرنے والے نے بیان کیا کہ مجھ کو ایک مقام پر لے گئے، وہاں پیشی کے وقت کہا گیا کہ اس شخص کو نہیں بلایا گیا، بلکہ دوسرے شخص کو بلایا گیا ہے، چناں چہ مجھ کو دنیا میں لوٹا دیا اور دوسرے کو دنیا سے بلایا گیا۔ یہ حکایت بیان کر کے پوچھا کہ کیا ایسا ممکن ہے؟

بعض اوقات کسی دوسری طرف توجہ ہونے سے بعض پہلوؤں پر نظر نہیں جاتی، کچھ نرم سا جواب فرما دیا۔ میں نے ادب سے عرض کیا کہ یہ تو ممکن نہیں معلوم ہوتا، اگر ملک الموت کو ایسی غلطی ہوسکتی ہے تو ملک الوحی سے بھی ہوسکے گی، پس کسی غالی کے اس قول کی صحت کی گنجائش نکل آوے گی: جبریل غلط کردہ مقصود علی بود۔ اور اس حکایت کی توجیہ صحیح اور سہل یہ ہے کہ وہ مریض مبرسم یا مسکوت تھا اور اس میں اس کا متخیلہ فاسد ہوگیا تھا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور نہایت انبساط کی ساتھ اس کی تصویب فرمائی۔

فائدہ: ١ مولانا کا کمال حق پرستی جس قدر اس سے واضح ہے محتاج بیان نہیں۔

فائدہ: ٢ اس کے قبل ایسا ہی واقعہ احقر کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کے حضور میں پیش آیا۔ مولانا کے جواب کے بعد یہی تقریر میں نے وہاں بھی کی تھی۔ مولانا قدس سرہ نے بھی اس کی تصویب فرمائی اور اس کے قبل بھی ایسی ہی حکایت میں نے حضرت مولانا الشیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ سے وعظ میں سنی تھی، میں اس وقت بچہ تھا کیا عرض کرتا اور نہ مولانا کی تحقیق اس مجلس کی مجھ کو یاد رہی۔

جام نمبر: ١٣ تتمہ جام نمبر: ١٢ ایک بار مجھ سے ارشاد فرمایا کہ حدیث میں ہے: لَنْ يُغْلَبَ اِثْنَا عَشَرَ أَلْفًا عَنْ قِلَّةٍ، اور اس میں کوئی قید مذکور نہیں، تو کیا یہ مطلق ہے اور ہر صورت کو شامل

ہے گو مقابلے میں لاکھوں کافر ہوں یا یہ کہ کسی اور دلیل سے مقید ہے؟ اطلاق پر یہ اشکال ہے کہ بہت جگہ اس عدد سے زیادہ ہونے کی صورت میں بھی مسلمان مغلوب ہو گئے ہیں، میں نے عرض کیا کہ ظاہر حدیث کا تو اطلاق ہی ہے اور بدون دلیلِ قوی کے تقیید کی کوئی وجہ نہیں اور مسلمانوں کا کہیں مغلوب ہونا کوئی دلیل نہیں، کیوں کہ جہاں مسلمان مغلوب ہوئے ہیں سبب اس کا کوئی علت ہے نہ کہ قلت اور وہ علت خواہ کوئی امرِ ظاہر ہو جیسے: نا اتفاقی، خواہ کوئی امرِ باطن ہو جیسے: عجب و نظر إلی الأسباب و نحوهما جیسا غزوۂ حنین میں مسلمان بارہ ہزار اور کفار چار ہزار (كما في الجلالين) مگر اول میں مسلمان مغلوب ہو گئے جس کا سبب عجب بالکثرۃ تھا (كما في القرآن المجيد إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ) پھر آخر میں وہی مغلوب غالب ہو گئے كما قال تعالى: ﴿ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾[1] اور یہ انزالِ سکینہ مشروط ہے زوالِ سببِ مغلوبیت کے ساتھ کہ وہ عجب ہے اور یہ زوال توبہ ہے، انتهى قولي بمعناه مولانا مسرور ہوئے اور اس کو پسند فرمایا۔

فائدہ: اس سے مولانا کی تواضع اور عدم استنکاف في طلب الحق وسعي زيادت في العلم ظاہر ہے جس میں امتثال ہے امرِ حق ﴿رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾[2] کا۔

جام نمبر ۱۱۴: ایک سفر میں مولانا کی معیّت میں ایک ہم وطن دوست کی طلب پر جودھ پور جانا ہوا اور لوگوں کی درخواست پر احقر کے متعدد بیانات ہوئے، جن سے بفضلہٖ تعالیٰ بہت نفع ہوا اور اہلِ بدعت کے خیالات میں بھی ایک درجہ میں نرمی و حسنِ ظن پیدا ہو گیا۔ ہر بیان کے ختم پر آئندہ بیان کے لیے لوگوں کی درخواست پر وقت اور موقع کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔ ایک شب میں ختمِ وعظ پر ان دوست صاحب نے ایسے موقع کے لیے اعلان کر دیا جہاں وعظ کی درخواست نہ تھی اور وہ محلّہ تمام تر اہلِ فساد اور اہلِ عناد کا تھا، اپنے نزدیک انھوں نے یہ مصلحت سمجھی کہ صبح کو جمعہ تھا اور اس محلّہ کی مسجد میں جمعہ بھی ہوتا تھا تو ان کو خیال یہ ہوا کہ اس طرح

[1] توبہ: ۲۶ [2] طٰہٰ: ۱۱۴

سے اہلِ محلّہ کے کان میں حق پہنچ جائے گا، مگر اس میں خرابی یہ ہوگئی کہ اول تو اس محلّہ کے اکثر لوگ سخت مبتدع و متعصّب تھے، پھر خصوصیت کے ساتھ ان کو ان دوست صاحب سے پہلے سے کچھ رنج بھی تھا، جس کا سبب جس طرح اہلِ محلّہ کی کج فہمی تھی کسی قدر ان دوست صاحب کی تیز زبانی بھی تھی، ان لوگوں کو یہ اعلان نہایت ناگوار ہوا اور وہ یوں سمجھے کہ انھوں نے ہم کو زک دینے کے لیے یہ کارروائی کی ہے اور تہیہ کر لیا کہ وعظ نہ ہونے دیں گے۔

ان دوست صاحب کو بھی قرائن سے اس کا خطرہ ضرور تھا انھوں نے یہ انتظام کیا کہ مجسٹریٹ صاحب کو جو کہ گلاؤٹھی کے رہنے والے اور خوش عقیدہ شخص تھے ایک درخواست دے دی کہ عین موقع پر پولیس کا انتظام کر دیا جائے، تاکہ کوئی فتنہ وفساد نہ ہو، چناں چہ درخواست منظور ہو کر ایک سب انسپکٹر مع چند جوانوں کے حاضر رہنے کے لیے مامور ہوگئے، ہم لوگوں کو اس کی اطلاع عین اس وقت ہوئی جب کہ جمعہ میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے اپنی طبیعت اور مذاق کے موافق یہ رائے قائم کی کہ ایسی تشویش کی جگہ جانا نہ چاہیے، اور تہیہ وعظ کا دل سے نکال دیا اور اس رائے کو مجمع میں ظاہر کر دیا۔ ان دوست صاحب نے تو یہ جواب دیا کہ سب لغو روایتیں ہیں اور یہ راوی جنھوں نے یہ حکایت کی تھی بزدل اور کم ہمت ہیں، یہ ہر جگہ یوں ہی ڈر جاتے ہیں ضرور چلنا چاہیے اور مولانا نے فرمایا کہ اگر ایسا ہو بھی تب بھی تبلیغِ حق میں ایسے امور کی پروا نہ کرنا چاہیے۔

ان دوست کی رائے کی تو مجھ کو کچھ وقعت نہیں ہوئی، کیوں کہ اس کا منشا میرے خیال میں دنیا تھی، مگر مولانا کے ارشاد پر میں خاموش ہوگیا گو میری رائے اب بھی وہی تھی کہ جانا مناسب نہیں، مگر دو وجہ سے موافقت کر لی، ایک: اس وجہ سے کہ منشا اس رائے کا دین ہے گو وہ امرِ اجتہادی ہے جس میں موافقت واجب نہیں مگر ناجائز بھی نہیں، دوسرے: اس وجہ سے کہ جب مولانا جانے کو تیار ہیں تو میں کیا چیز ہوں کہ اپنی جان بچاؤں، غرض سارا مجمع وہاں پہنچا، مگر رنگ بدلا ہوا پایا، نہ کسی نے سلام کیا، نہ کلام کیا اور امامت کے لیے تو کیا پوچھتے۔ نماز سے فراغت ہوئی، ان دوست صاحب نے اعلان کیا کہ وعظ ہوگا، فوراً محلّہ کے ایک شخص نے

نہایت تند آواز سے کہا کہ وعظ نہ ہوگا، پھر کیا تھا دونوں طرف سے آویزش ہوگئی اور اس قدر شور وغل ہوا کہ خدا کی پناہ! جمعہ کی سنتیں بھی بھول گئے اور اس فرض میں مشغول ہوگئے۔ میں اور مولانا ایک کنارے پر سنتیں پڑھنے لگے، مگر مولانا تو مطمئن اور میں متفکر کہ دیکھیے اس کا کیا انجام ہوتا ہے اور پولیس کا کہیں نام ونشان نہیں، یہاں تک اختلاف کی نوبت پہنچی کہ ایک شخص جا کر منبر پر بیٹھ گیا، یہ سمجھا کہ جب منبر پر میرا قبضہ ہو جاوے گا پھر وعظ کیسے ہوگا اس سے جہل کا اندازہ کرلیا جاوے۔

ایک خان صاحب ہمارے محبین میں اس مزاج کے تھے کہ وہ خنجر لے کر اس منبر نشین پر حملہ آور ہوئے، ایک خان صاحب ٹونک کے جو سنجیدہ مزاج تھے اس وقت موجود تھے انھوں نے حملہ آور صاحب کا پیچھے سے ہاتھ پکڑ لیا کہ یہ کیا کرتے ہو؟ ابھی سب پھنس جاویں گے وہ خفا ہو کر اس مجمع سے چلے گئے اور یہاں شور وغل کی وہی حالت۔ جب میں سنتیں پڑھ چکا اور معلوم کرلیا کہ یہ سارا غیظ اس احتمال پر ہے کہ کہیں وعظ نہ ہونے لگے تو میں نے اس فتنہ کے سرغنہ کو اپنے پاس بلایا، غنیمت ہے کہ وہ آبیٹھے اور نہایت غصّے سے کہا: کہیے۔ میں نے کہا کہ کیا تم کو یہ شبہہ ہے کہ وعظ ہوگا؟ سو سن لو! وہ واعظ میں ہوں اور میرا وعظ ایسا ارزاں نہیں ہے کہ کسی کے سر ہو کر کہوں، میں تو بہت خوشامد کرا کر وعظ کہتا ہوں اور اس حالت میں تو میں کسی طرح کہہ ہی نہیں سکتا، تم اطمینان رکھو میں ہرگز وعظ نہ کہوں گا، بلکہ اب تو اگر تمام اہلِ محلّہ بھی درخواست کریں تب بھی نہ کہوں، تم لڑو مت اور یہ اعلان میرے مشورے سے نہیں ہوا، بلکہ خلافِ مزاج ہوا، یہ سنتے ہی وہ شخص ٹھنڈا ہوگیا اور اس کے ٹھنڈے ہونے سے سب خاموش ہوگئے۔

میں نے بواسطہ دوسرے شخص کے اس کے بعد یہ قول سنا ہے کہ وہ کہتا تھا کہ ان لوگوں کی کیا بات ہے! ان کی تو جوتیا ہم اپنے سر پر رکھ لیں، یہ سارا فساد فلاں شخص کا ہے جس نے اپنی رائے سے اعلان کردیا اور یہ بھی مسموع ہوا کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ ہم کو وعظ ہونا ناگوار نہ تھا، بلکہ یہ متغلبانہ تصرف ناگوار ہوا، ہم کو خاص طور پر اطلاع کی جاتی ہم خود حاضر ہو کر وعظ کی درخواست کرتے، پھر آنے والوں کے لیے خاص طور پر فرش کا، برف کا، شربت کا انتظام

کرتے، اس طرح سے ہماری سخت اہانت تھی جو ہم کو گوارا نہیں ہوا، جب فضا میں سکون ہوا ہم لوگ مسجد سے واپس آرہے تھے کہ سب انسپکٹر صاحب مع گارڈ کے راستہ میں ملے کہنے لگے کہ چلیے وعظ کہیے، میں نے کہا۔ سبحان اللہ! کیا موقع پر پہنچے ہیں یہاں تو خون ہو جاتا آپ کا آنا کس مصرف کا ہوا؟ اور اب وعظ نہیں ہوسکتا، وعظ کیا ہوا کھیل ہوا، یہ وہی بات ہوئی ''پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد'' اور وہ بات ہوئی ''ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھیری''۔ اس وقت مولانا یہ فرمارہے تھے کہ راہِ حق میں ایسی کلفت بھی کیسی لذت بخش ہے۔

فائدہ: مقصود اس قصہ کے نقل کرنے سے مولانا کا یہ قول نقل کرنا تھا جس سے مولانا کا مذاق ﴿وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ﴾[1] کے اتباع کا کس قدر وضوح سے ثابت ہوتا ہے جس میں اپنی ہمت کو قاصر دیکھتا تھا آخر ضعیف وقوی اور ناقص وکامل میں فرق تو ہونا چاہیے، ولنعم ماقیل في مثل هذا:

نہ از دعشق را کنج سلامت خوشا رسوائی کوئے ملامت

﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾[2]

جام نمبر ۱۵: ایک سفر میں مولانا کی معیّت میں بسواری ریل بہاول پور سے واپسی ہو رہی تھی، اتفاق سے اس درجہ میں صرف میں اور مولانا ہی تھے اور رفقا دوسرے درجہ میں تھے، ظہر کا وقت تھا گرمی سخت تھی اور پسینہ کثرت سے نکل رہا تھا، مولانا غایتِ تواضع اور بے تکلفی سے پنکھا ہاتھ میں لے کر مجھ کو ہوا کرنے لگے، میں اس کا تحمل کب کرسکتا تھا پریشان ہو کر پنکھا پکڑ لیا فرمانے لگے: کیا حرج ہے؟ کوئی دیکھتا تھوڑا ہی ہے۔ یہ اس لیے فرمایا تھا کہ اس وقت درجہ میں کوئی تیسرا نہ تھا۔ میں نے عرض کیا کہ دیکھتا تو ہے۔ فرمایا: کون دیکھتا ہے؟ میں نے کہا کہ جس کے لیے میں آپ کا ادب کرتا ہوں وہ دیکھتا ہے، ہنسنے لگے اور پنکھا چھوڑ دیا۔

فائدہ: کیا انتہا ہے! اس بے نفسی کی کہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ یہ برتاؤ اور اس سے بڑھ کر یہ کمال ہے کہ جب دیکھا کہ طبیعت پر گرانی ہے تو اپنے ارادہ پر اصرار نہیں فرمایا اور یہ کمال بڑھ

[1] لقمان: ۱۷ [2] مطففین: ۲٦

کر اس لیے ہے کہ پہلے عمل میں تو اپنے رفیق کے جسم کی رعایت تھی اور دوسرے عمل میں قلب کی رعایت اور ثانی کا اول سے اکمل ہونا ظاہر ہے۔

جام نمبر ۱۶: مجھ کو متعدد سفروں میں مولانا کی معیت کا اتفاق رہا، میں بکثرت دیکھتا تھا کہ محنت مشقت کا کام کرنے میں، بوجھ اٹھانے میں نہ کسی رفیق کا انتظار فرماتے تھے اور نہ کسی اجیر کا، ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنے کو آمادہ ہو جاتے تھے گو خدام اس کی تکمیل نہ ہونے دیتے تھے، مگر بعض اوقات خدام سے سبقت فرما جاتے تھے۔

فائدہ: اپنا یا رفقا کا کام اپنے ہاتھ سے کرنا عین اتباعِ سنت ہے کہ حضور اقدس ﷺ اپنے ہم راہیوں سے ممتاز ہو کر نہ رہتے تھے، خصوصاً سفر میں اور اکثر کام اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے۔

جام نمبر ۱۷: ایک بار میں سہارن پور غالباً جلسۂ مدرسہ میں حاضر ہوا، بعد جلسہ کے ایک گاؤں والوں نے (جس کا نام غالباً شیخ پورہ ہے) مولانا کو مع دوسرے خدام اور احقر کے مدعو کیا، اور اس سے دوسرے دن ایک تاجر چاول مقیم سہارن پور نے ہم سب کی مع بعض مہمانان مقیمین دعوت کی، مولانا نے وعدہ فرما لیا کہ گاؤں سے صبح کو واپس آ کر دوپہر کا کھانا تمہارے یہاں کھا لیں گے، شام کو گاؤں گئے اور شب کو وہاں مقیم رہے پھر صبح کو عین ایسے وقت کہ خوب زور سے بارش ہو رہی تھی اسٹیشن پٹری پر سوار ہوئے، اہلِ موضع ایسے وقت کے سفر کو گوارا نہ کرتے تھے اور قیام پر مصر تھے، لیکن چوں کہ ان سوداگر صاحب سے وعدہ تھا اس لیے بھیگتے ہوئے ریل پر پہنچے اور سہارن پور اترے، گاڑی میں بیٹھے ہوئے مدرسہ کو آ رہے تھے کہ راستہ میں وہ سوداگر صاحب ملے، مولانا نے گاڑی ٹھیرا کر یا آہستہ کرا کر (یاد نہیں) ان کو اپنی واپسی کی اطلاع کی کہ ہم لوگ اپنے وعدے پر آ گئے ہیں تو آپ کیا مزے کا جواب دیتے ہیں کہ مجھ کو امید واپسی کی نہ تھی اس لیے میں نے کچھ سامان نہیں کیا۔

اب کل صبح کی دعوت ہے، اس وقت مولانا کا حلم اور میرا غصہ دیکھنے کے قابل تھا، مگر بوجہ ادب کے غصہ ظاہر نہ کر سکتا تھا اور مولانا نے منظور فرما لیا اور کھڑے چڑھے سب مہمانوں

کے کھانے کا انتظام فرمانا پڑا۔ اگلے دن کی دعوت سے میں نے عذر کردیا جس کی اصل وجہ تو غصّہ تھا، مگر ظاہری عذر یہ کیا کہ سویرے بھوک نہیں لگتی اور دیر میں ریل نہ ملے گی اور مجھ کو کل وطن جانا ضروری ہے، مولانا نے سفارش فرمائی کہ دعوت میں شریک ہو جانا، اگر رغبت ہوئی کچھ کھالینا ورنہ اصرار نہ ہوگا۔ چناں چہ اگلے روز سب حضرات ان کے مکان پر پہنچے اور کھانا لایا گیا، میں بھی بیٹھا رہا، مگر کھانے کی خواہش نہیں ہوئی، کچھ تو غصّہ کے سبب، کچھ خلافِ معمول ہونے کے سبب، تھوڑی دیر میں اجازت لے کر مکان سے باہر آیا اور صاحبِ دعوت کو بھی فرمائش کر کے ہمراہ لایا اور باہر آ کر ان کی اس نامعقول حرکت پر اچھی طرح کان کھولے اور توبہ کرائی۔

فائدہ: اس سے مولانا کا حلم ظاہر ہے اور حلم بھی اتنے درجہ کا کہ میں اس میں ساتھ نہیں دے سکا۔

جام نمبر ۱۸: احقر کو بعض امورِ اجتہادیہ ذوقیہ متعلقہ معاشرت وانتظام میں رائے کا اختلاف[1] تھا اور اس اختلاف کے ہوتے ہوئے میرا یہ خیال تھا کہ مجھ کو مولانا سے صرف اعتقادِ عقلی ہو سکتا ہے انجذابِ طبعی نہ ہوگا، مگر کیفیت یہ تھی کہ حاضری تو حاضری تصور کرنے سے اس قدر انجذاب ہوتا تھا کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا اور غالباً اسی کا اثر ہوگا کہ خواب میں بھی اگر کبھی زیارت ہوتی تو اسی شان سے ہوتی، یہ کھلی دلیل ہے محبوبیت کی کہ محبّ کو گمان بھی نہیں بلکہ احتمال عدم کا ہے، مگر طبیعت ہے کہ کھنچی چلی جاتی ہے اور میں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت اپنے اوپر سمجھتا ہوں کہ اس اختلاف کے ضرر سے مجھ کو محفوظ رکھا۔

جام نمبر ۱۹: احقر نے جو عقدِ ثانی کیا اس کے دوران میں یا بعد میں (یاد نہیں رہا) بعض ثقات سے معلوم ہوا کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں پہلے ہی سے اس کا استحسان تھا اور رائے بھی ظاہر فرمائی تھی، مگر غالباً یہ خیال تھا کہ احقر منکوحۂ اولیٰ کے سبب اس کی ہمت نہ کرے، جب اس کا وقوع ہو گیا بہت مسرت ظاہر فرمائی اور میری اس درخواست کے جواب میں کہ ”اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ اس میں برکت فرماوے“ یہ فرمایا کہ ہم کو تو برکات کی توقع ہے۔ (كما في إصلاح انقلاب).[2]

---

[1] برضمیمہ: ۶۱/ ۱۷۔ [2] برضمیمہ: ۶۶/ ۱۸۔

فائدہ: اس سے مولانا کا تعلق نیاز مندوں کی مصالحِ ظاہرہ و باطنہ سے ظاہر ہے، یہ شان فیوضِ نبوت سے ہے، ورنہ مقامِ ولایت کے فیض کی شان دوسری ہوتی ہے کہ کسی مصلحت میں دخل نہ دیا جائے اور اول کا اکمل ہونا معروف ہے۔

جام نمبر ۴۰: اور اس جام میں دوسرے نوع جام کی طرف بھی اشارہ ہے جو اس شعر میں مذکور ہے:

ہرآں کہ زاد بناچار بایدش نوشید
زجام دہرمے کل من علیہا فان

یعنی اس میں وفات کے بعد برزخ کا ایک واقعہ مذکور ہے گو ظنی ہے، لیکن مبشرات میں سے ہونے کے سبب قابلِ ذکر ہے اور یہ ایک ثقہ کا خواب ہے جن کا نام محمد عمر فاروق مقیم غازی پور زیر قلعہ کہنہ ہے، ان کا خط ۱۳؍رجب ۱۳۴۶ھ کو میرے پاس آیا جو بعینہٖ منقول ہے اور اسی پر اس عجالہ کو ختم کرتا ہوں، وھو ھذا: حال میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کی بھی زیارت سے شرف یاب ہوا ہوں، مولانا مرحوم کو خواب میں بہت ہی خوش دیکھا، احقر نے عرض کیا کہ آپ تو زندہ ہیں لوگوں نے ناحق وفات کی خبر اڑادی، اس پر مولانا نے ہنس کر فرمایا: میں تو زندہ ہوں پھر یہ دیکھا کہ مولانا کسی طالب علم کو مالا بدمنہ پڑھانا چاہتے ہیں، انتهت الرؤیا۔

فائدہ: تعبیر ظاہر ہے یہ ارشاد کہ میں تو زندہ ہوں مصداق ہے اس قول کا:

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما

اور مالا بدمنہ پڑھانا اشارہ ہے مولانا کے جامع بین الفقه الظاهر و الفقه الباطن کی طرف، کیوں کہ مالا بدمنہ کے مصنّف دونوں کے جامع ہیں، اس کے ساتھ ہی اشارہ ہے شان غلبۂ فقہ ظاہر کی طرف، چناں چہ مالا بدمنہ میں غالب حصّہ یہی ہے، والله أعلم.

وهذا آخر ما أردت إيراده في هذا الحين، نفع الله به الطالبين ورزقنا حبه وحب نبيّه وحب الصالحين، فقط.

أوائل ذی قعدہ ۱۳۴۶ مقام تھانہ بھون۔

ضمیمہ خوانِ خلیل

بعد الحمد الصلاۃ.

۱۔ متعلقہ صفحہ ۵: (ترجمہ) مولانا عارف جامی نے حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خریداروں کے بارے میں نقل فرمایا ہے (ترجمۂ اشعار) جب حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کی گرم بازاری ہوئی تو سب اہلِ مصران کے خریدار بن گئے۔ جس مال پر جو شخص جتنی قدرت رکھتا تھا اس بازار میں ان کی خریداری کی ہوس رکھتا تھا۔ میں تے سنا کہ ان کے غم سے ایک بڑھیا بہت پریشان سوت کے چند دھاگے لے کر کہہ رہی تھی کہ اگر میرے پاس پونجی کھوٹی ہے تو میرے لیے یہی کافی ہے کہ ان کے خریداروں کی قطار میں میرا شمار ہو جائے۔

اسی مخلص بڑھیا کی تقلید ان سطور کی تحریر میں احقر نے اختیار کی ہے کہ ایک حبرِ ہمام اور بحرِ قمقام یعنی (ترجمہ اشعارِ عربی) حضرت مولانا خلیل احمد جو کہ حق تعالیٰ شانہ کی محبت کے لباس سے آراستہ ہیں اور حضرت ابراہیم علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہم نام اور اپنے زمانہ کے یوسف جن کا چہرۂ انور روشنی میں قلبِ مبارک کے مانند ہے، جن کی وفات ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ میں ہے، اللہ تعالیٰ ان کے فیوض و برکات سے دور اور نزدیک سب لوگوں کو مستفیض فرمائے کہ دریائے کمالات میں سے (آگے ترجمہ کی حاجت نہیں)۔

۲۔ متعلقہ صفحہ ۶: ''یادِ یاراں'' حضرت قطب الارشاد شیخ المشائخ حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے وصال پر تصنیف فرمایا تھا اور ''ذکرِ محمود'' حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ کے وصال پر لکھا تھا اور دونوں رسالے اسی وقت مستقل طبع بھی ہو گئے تھے۔

۳۔ متعلقہ صفحہ ۶: حضرت نور اللہ مرقدہ ۱۳۱۵ھ میں کان پور سے ملازمت چھوڑ کر اپنے

وطن مستقل طور پر خانقاہ امدادیہ میں رونق افروز ہوئے۔

۴۔ متعلقہ صفحہ ۷: حضرت سہارن پوری نور اللہ مرقدہ ۱۲۸۸ھ یا ۱۲۸۹ھ میں حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہی سے بیعت ہوئے تھے، جیسا کہ خود حضرت سہارن پوری کی تحریر ''مقدمہ اکمال الشیم'' میں لکھا ہے اور اس بیعت کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ اس کے بعد ۱۲۹۷ھ میں جب کہ حضرت سہارن پوری کا دوسرا سفرِ حج تھا، حضرت قطبِ عالم مولانا رشید احمد گنگوہی نے اپنے پیر و مرشدِ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کو بطور سفارش کے یہ تحریر فرمایا کہ مولوی خلیل احمد حاضرِ خدمت ہوتے ہیں، حضرت ان کی حالت پر مطلع ہوکر مسرور ہوں گے، چناں چہ جب آپ حاضر ہوئے تو اعلیٰ حضرت آپ کی باطنی کیفیت مشاہدہ فرما کر نہایت خوش ہوئے اور جب آپ محرم ۱۲۹۸ھ میں واپس ہونے لگے تو چھاتی سے لگایا اور اپنی دستار مبارک اپنے سر سے اتار کر حضرت سہارن پوری کے سر پر رکھ دی، اور حضرت گنگوہی کے نام مبارک باد کا خط اور حضرت سہارن پوری کے نام کا خلافت نامہ مزین بمہر آپ کے حوالہ فرما کر آپ کو رخصت کیا۔

حضرت نے اس شاہی عطیہ کو ایک خاص احترام کے ساتھ قبول کیا اور دستار مبارک کو اسی بندش پر جو اعلیٰ حضرت کی باندھی ہوئی تھی جگہ جگہ سوئی سے سی لیا کہ اس کے بل جدا نہ ہونے پائیں۔ اور جب ہندوستان پہنچ کر گنگوہ حاضر ہوئے تو اعلیٰ حضرت کا والا نامہ پیش کر کے یہ دونوں عطیے بھی حضرت گنگوہی کے سامنے رکھ دیے۔ حضرت نے فرمایا کہ مبارک ہو یہ تو اعلیٰ حضرت کا عطیہ ہے، آپ نے عرض کیا کہ بندہ تو اس لائق نہیں، یہ حضور کی بندہ نوازی ہے اور میرے لیے تو وہی مبارک ہے جو آں حضرت کی طرف سے عطا ہو۔ نیز یہ بھی عرض کیا کہ اجازت نامہ درحقیقت شہادت ہے کسی مسلمان کے ایمان کی، لہٰذا دو مقبول شہادتیں ثبت ہوں گی تو ہر شخص کی نفسی نفسی پکارنے کے وقت بارگاہِ خدا میں پیش کر سکوں گا۔ حضرت امام ربانی آپ کے اس حسنِ ادب سے کہ اصل کمال یہی ہے بہت خوش ہوئے اور خلافت نامہ پر دستخط فرما کر مع دستار آپ کے حوالہ فرما دیا۔ (تذکرۃ الخلیل: ۵۸)

۵۔ متعلقہ صفحہ ۷: حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہ طالب علمی کے آخری دور ۱۲۹۹ھ میں بحالت قیام دیوبند بذریعۂ خط شیخ العرب والعجم سید الطائفہ حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہوئے (تمہید تربیۃ السالک) حضرت تھانوی نے ''یادِ یاراں'' کے شروع ہی میں اس قصّہ کو خود تحریر فرمایا ہے کہ سب سے اول اس نااہل کو اس مرکز دائرۂ ارشاد کی زیارت اس وقت ہوئی جب میں مدرسۂ دیوبند میں پڑھتا تھا اور وہاں حضرت اپنی تشریف آوری سے اہلِ مدرسہ کو واہلِ شہر کو گاہ گاہ مشرف فرمایا کرتے تھے۔ سن یاد نہیں رہا دیکھنے سے میرے قلب میں جو عقیدت اور محبّت پیدا ہوئی وہ میرے لیے باعث اس کی ہوئی کہ باوجود حقیقت وغایتِ بیعت کے نہ سمجھنے کے میں نے بیعت کی درخواست کی، چوں کہ طبیبِ حاذق کو مریض کی رائے کا اتباع ضرور نہیں بلکہ اگر ایسا کیا جاوے تو مریض کے لیے مضر بھی ہے، اس لیے آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک علم سے فراغ نہ ہو جائے اس وقت تک ایسا خیال وسوسۂ شیطانی ہے۔

اس وقت میری سمجھ میں اس جواب کی حقیقت وعظمت اور حکمت مطلق نہ آئی اور غلط فہمی سے اس کو دفع الوقتی پر محمول کیا الـــخ۔ آگے حضرت نے اس کی مصالح بتلائی ہیں، اس واقعہ کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح میں اور بھی مفصّل لکھا ہے جس کو مختصر نقل کراتا ہوں۔ ''چوں کہ بمصلحت اشاعت معارفِ امدادیہ حضرت کا حضرت حاجی صاحب سے تعلّقِ بیعت روزِ ازل ہی سے مقدر ہو چکا تھا، اس کا غیب سے سامان یہ ہوا کہ ایک مرتبہ حضرت گنگوہی دیوبند تشریف لائے تو حضرت والا بغرضِ مصافحہ دوڑے تو ان اینٹوں کی وجہ سے جو وہاں نو درہ کی تعمیر کی وجہ سے پڑی تھیں حضرت کا پاؤں بے اختیار پھسلا اور گرنے ہی کو تھے کہ حضرت گنگوہی نے فوراً ہاتھ پکڑ کر سنبھال لیا، حضرت والا کو حضرت گنگوہی کی زیارت ہوتے ہی اس قدر کشش اور عقیدت ہوئی کہ بیعت کی درخواست کی، مولانا نے اس بنا پر بزمانۂ طالب علمی کہ شغلِ باطن مخل تحصیلِ علم ہوگا انکار کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد قریب ہی جب مولانا گنگوہی ۱۲۹۹ھ میں تیسرے حج کو تشریف لے

جانے لگے تو حضرت نے حاجی صاحب کی خدمت میں اس مضمون کا عریضہ لکھ کر غالباً خود مولانا ہی کے ہاتھ بھیجا کہ میں نے تو مولانا سے بیعت کے لیے عرض کیا تھا انھوں نے انکار فرما دیا، آپ مولانا سے فرما دیں کہ مجھ کو بیعت کرلیں، لیکن حضرت حاجی صاحب نے بجائے مولانا سے سفارش فرمانے کے حضرت والا کو خود ہی شرفِ بیعت سے غائبانہ مشرف فرمایا اور اب معلوم ہوا کہ مولانا کے انکارِ بیعت میں یہ قدرتی سبب در پردہ کارفرما تھا کہ حضرت والا حضرت حاجی صاحب ہی کے حصّہ میں آنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب ہو چکے تھے''۔ ''اشرف السوانح'' صفحہ: ۱۶۶ میں اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے جس کو دیکھنا ہو وہاں دیکھ لے۔ حضرت حاجی صاحب نے اس کے بعد حضرت کے والد ماجد کو لکھا کہ جب تم حج کو آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو لے کر آنا۔ چناں چہ ۱۳۰۱ھ میں حضرت حکیم الامت مکّہ مکرمہ حاضر ہوئے اور حضرت حاجی صاحب سے دست بدست بیعت ہوئے اور پھر ۱۳۰۲ھ میں تشریف آوری ہوئی، حضرت حاجی صاحب نے حضرت حکیم الامت سے فرمایا کہ چھ مہینے میرے پاس رہ جاؤ، مگر والد صاحب نے مفارقت گوارا نہ کی، اس پر حاجی صاحب نے یہ فرما کر کہ والد کی اطاعت مقدم ہے، اب تو چلے جاؤ پھر دیکھا جائے گا۔

دس برس تک حضرت حکیم الامت کو حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضری کا اشتیاق بڑھتا ہی رہا اور خط و کتابت بھی اس درمیان میں ہوتی رہی جو ''اشرف السوانح'' میں موجود ہے بالآخر ۱۳۱۰ھ میں حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں چھ ماہ قیام کرنے کی نیت سے روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچ کر حضرت حاجی صاحب کی وہ شفقتیں اور خصوصی توجہات بڑھیں کہ دیکھنے والوں کو حسد ہوگیا۔ حضرت حکیم الامت کے الفاظ ہیں ''ارادہ تو چھ ماہ قیام کا تھا، مگر لگائی بجھائی کرنے والوں اور حاسدوں سے یہ اندیشہ ہوا کہ ابھی تو میں مقبول ہوں آیندہ کہیں یہ حاسدین حضرت کو میری طرف سے مکدر نہ کردیں اس لیے ہفتہ عشرہ پہلے ہی روانہ ہوگیا۔'' اس دوران قیام میں حضرت حاجی صاحب نے سرسید مرحوم کو ایک خط حضرت تھانوی سے لکھوایا جس کے بھیجنے میں بعض خدام مانع ہوئے۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے کئی

دفعہ فرمایا کہ اگر وہ خط بھیج دیا جاتا تو امید ہے کہ اصلاح ہو جاتی، مگر ہمارے دوستوں کی رائے نہ ہوئی، یہ ''خط اصلاح الخیال'' کے آخر میں طبع ہو گیا ہے۔

۶۔ متعلقہ صفحہ ۸: یہ واقعہ آپ بیتی ۴/۴۷ پر حضرت تھانوی کے حالات کے ذیل میں اس سیہ کار نے بھی لکھا ہے، کیوں کہ یہ سیہ کار بھی اس دعوت میں شریک تھا، اس میں بندے نے باسٹھ رکابیاں لکھی ہیں اور اس دعوت کی کچھ مزید تفصیل بھی لکھی ہے شرکائے طعام تو چار ہی تھے: حضرت سہارن پوری نور اللہ مرقدہ اور یہ سیہ کار اور خود حضرت تھانوی اور وہ رئیس تھانہ بھون جن کا اسمِ گرامی جب حضرت قدس سرہ نے نہیں لکھا تو میں کیوں لکھوں؟

۷۔ متعلقہ صفحہ ۹: یہ محاکمہ تتمہ جلد رابع ''فتاوی امدادیہ'' کے آخر میں ۳۲۲ پر بہت تفصیل سے لکھا ہوا ہے، چار صفحات پر ۳۲۲ سے مذکور ہے، جس میں زید و عمرو کے اقوال اور ان کے دلائل ذکر کیے گئے ہیں، ابتدا اس مضمون سے ہے:

''محاکمہ متعلقہ مسئلۂ تصویر از مولانا خلیل احمد صاحب''۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس باب میں کہ زید و عمرو میں حسبِ ذیل مکاتبت ہوئی، اس میں حق کس کی تقریر ہے؟ اور اگر زید کی تقریر حق ہے تو عمرو کی اخیر تقریر کا کیا جواب ہے؟ وجہ اس مکاتبت کی یہ ہوئی کہ عمرو نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ پشت کی طرف سے فوٹو لینے میں جس میں چہرہ نہ آوے گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور ''درِ مختار'' کی روایت ممحوۃ الوجہ سے اس کا استدلال تھا، اس پر زید کی تقریر ہوئی، پھر اس پر آگے سلسلہ چلا۔ آگے زید و عمرو کی طویل مکاتبت جو مسئلۂ فقہیہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں کثرت سے عربی عبارتیں ہیں مذکور ہے۔ ان سب کی یہاں ضرورت نہیں اصل ''امداد الفتاوی'' میں جس کو دیکھنا ہو دیکھ لے، اس جگہ تو صرف خوانِ خلیل کی مناسبت سے حضرت سہارن پوری کا محاکمہ نقل کرنا ہے جس کی طرف حکیم الامت نے اپنے اس جام میں اشارہ فرمایا ہے۔

الجواب حامداً و مصلیاً

بندۂ ناچیز باعتبار اپنے علم و فہم کے اس قابل نہیں ہے کہ علمائے اعلام کے اختلاف کا

فیصلہ کر سکے، مگر ہاں! امتثالاً للأمر الشریف اس مسئلہ میں جو کچھ خیال میں آیا ہے عرض کرتا ہے۔ روایاتِ فقہیہ کے دیکھنے سے یہ امر واضح ہے کہ عملِ تصویر اور اقتنائے تصویر میں فقہا کے نزدیک فرق ہے، تصویر سازی کو مطلقاً حرام اور ناجائز تحریر فرماتے ہیں اور اقتنائے تصویر کو مطلقاً ناجائز نہیں لکھتے، بلکہ بعد تغیرات جائز تحریر فرماتے ہیں، لہٰذا ان وجوہ سے زید کا قول حق معلوم ہوتا ہے کہ فوٹو لینے میں کسی جان دار کے خواہ وجہ کی طرف سے لیا جائے یا پشت کی طرف سے عدمِ جواز ہو، اگرچہ زید کی تعمیم مستبین الاعضاء ہو یا غیر مستبین الاعضاء ان دونوں کی مساوات روایات سے مفہوم نہیں ہوتی اور روایتِ ''ترمذی'' و''ابوداود'' جس کے الفاظ یہ ہیں: فمر بالتمثال الذي علی باب البیت فیقطع فیصیر کھیئة الشجرة اس امر کے اوپر دلالت کرتی ہے کہ بعد قطع راس تصویر ذی روح کی باقی نہیں رہتی بلکہ وہ کالشجرہ ہو جاتی ہے، حالاں کہ وہ تصویر ظاہراً حیوان ہی کی تصویر معلوم ہوتی ہے اور مضاھاتاً بخلق اللّٰہ جو علتِ حرمت ہے متحقق معلوم ہوتی ہے، اور نیز مخصوص راس کا مختلف فیہ ہونا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ جب بعض اجزائے اصلیہ مفقود ہو گئے تو وہ تصویر ذی روح کی تصویر نہ رہی، ''ردالمختار'' میں ہے: وفیه إشعار بأنه لاتکره صورة الراس وفیه خلاف کما في اتخاذھا، کذا في "المحیط".

معلوم ہوتا ہے کہ بعض فقہا نے ایسے جز کا حکم کل کا قرار دیا ہے اور ذی روح قرار دے کر اس کو منع کیا ہے اور بعض نے اس کو غیر ذی روح قرار دیا ہے اور جائز فرمایا ہے۔ بندے کے نزدیک ایسے اختلاف کی صورت میں اس خلاف کو نزاعِ لفظی پر محمول کیا جاوے اور حرمت کا محمل عام اس کو قرار دیا جاوے کہ جب قصداً کسی ذی روح کی تصویر پشت کی جانب سے لی جاوے تو بروئے اطلاقِ روایات ناجائز ہو اور جب کہ تصویر کا لینا مقصود نہ ہو، مثلاً کسی مکان یا جنگل یا پہاڑ کی تصویر لینی مقصود ہے اور پشت کی جانب سے کسی انسان کی تصویر آگئی یا اس قدر صغیر ہے کہ جو قریب سے بھی بدشواری فہم میں آتی ہے گویا مقدارِ طیر سے بھی کم ہے تو ایسی صورت میں جائز کہہ دیا جاوے تو بظاہر کچھ مضائقہ نہیں، واللّٰہ أعلم بالصواب، حررہ خلیل أحمد عفي عنه۔

۸۔ متعلقہ صفحہ ۹: ''بیان القرآن'' کے حاشیہ پر مختلف توجیہات کے بعد یہ عبارت ہے:
"والذي تحرر عندي فيه وفيما ورد من أمثاله على تقدير ثبوت هذه الروايات أن هولاء رضي الله تعالى عنهم سمعوا القرآئة التي اختاروها من رسول الله صلى الله عليه وسلم وعلى آله وسلم تسليما ولم يسمعوا القرائات الموجودة. ثم أن تلك القراءة نسخت ولم يبلغهم الخبر، فداوموا عليها وأنكروا غيرها بمخالفة ظاهر القواعد وعدم سماعه، كما كان أبو الدرداء يقرأ "والذكر والأنثى" وكانت عائشة تقرأ "خمس رضعات" فاحفظ، كذا أفاد جامع الفضائل العلمية والعملية". مولانا خلیل احمد انبیٹھوی دامت برکاتہم۔

۹۔ متعلقہ صفحہ ۱۰: یہ ''امداد الفتاویٰ'' جلد چہارم طبع ہند کے ص: ۲۲۷ سے ص: ۲۳۶ تک ہے۔ علمی مسائل ہیں جس کا جی چاہے اصل سے مراجعت کرلے۔ عنوان اس کا یہ ہے: ''بعضے از تحریرات سیدنا ومولانا خلیل احمد صاحب دامت برکاتہم کہ در جواب سوالات صاحب فتاوی صدور یافتہ بمناسبت مقام در آخر ملحق کردہ شد''۔ پہلا مسئلہ بعض قرءات کے متعلق ہے، طویل مضمون ہے۔ اس کا خلاصہ جام: ۷ کے اندر آچکا ہے۔ اس کے بعد حضرت نے تحریر فرمایا کہ پہلی مکاتبت تو ختم ہوگئی، اب دوسری مکاتبت شروع ہوتی ہے۔

مخدومنا ومقتدانا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب! دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اتفاق سے ایک مبتدع کی کتاب میں بعض شبہات نظر سے متعلقہ بمعجزہ گزرے جن کے شافی کافی جواب کے لیے طبیعت جویاں ہے اور اس غرض سے اس وقت تکلیف دیتا ہوں (معجزات کے متعلق اور جھوٹا دعوائے نبوت کرنے والے کے متعلق طویل مضمون ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں) کہ دو مسئلے فروع میں سے قابلِ تحقیق ہیں: ایک یہ کہ مدرسہ میں جو روپیہ آتا ہے اگر یہ وقف ہے تو بقائے عین کے ساتھ انتفاع کہاں ہے؟ اور اگر یہ ملک معطی کا ہے تو اس کے مرجانے کے بعد واپسی ورثہ کی طرف واجب ہے۔

الجواب: عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں، مگر اہلِ مدرسہ مثل عمالِ بیت المال معطیین اور آخذین کی طرف سے وکلا ہیں، لہٰذا اس میں نہ زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطیین واپس لے سکتے ہیں۔

(مکرر سوال) حضرت مخدومنا! ادام اللّٰہ ظلال فیوضھم علینا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شفاء نامہ مزیلِ مرض ہوا، لیکن اساسِ شبہہ ہنوز قطع نہیں ہوئی (اس کے بعد پہلا نمبر تو معجزات کے متعلق ہے اور دوسرا نمبر یہ ہے) عمالِ بیت المال منصوب من السلطان ہیں اور سلطان کی ولایت عامہ ہے اس لیے وہ سب کا وکیل بن سکتا ہے اور مقیس میں ولایت عامہ نہیں ہے اس لیے آخذین کا وکیل کیسے بنے گا؟ کیوں کہ نہ تو کیل صریح ہے اور نہ دلالتاً ہے اور مقیس علیہ میں دلالتاً ہے کہ سب اس کے زیرِ طاعت ہیں اور وہ واجب الاطاعت ہے۔

الجواب: سیدی ادام اللّٰہ فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

بندے کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں، ایک: حکومت جس کا ثمرہ تنفیذ حدود وقصاص ہے، دوسرا: انتظامِ حقوقِ عامہ۔ امر اول میں کوئی اس کا قائم مقام نہیں ہوسکتا، امر ثانی میں اہل حل وعقد بوقت ضرورت قائم مقام ہوسکتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اہل حل وعقد کی رائے ومشورہ کے ساتھ نصبِ سلطان وابستہ ہے جو بابِ انتظام سے ہے، لہٰذا مالی انتظام مدارس جو برضائے ملاک وطلبہ ابقائے دین کے لیے کیا گیا ہے بالاولی معتبر ہوگا، ذرا غور فرماویں انتظام جمعہ کے لیے عامہ کا نصبِ امام معتبر ہونا ہی جزئیات میں اس کی نظیر شاید ہوسکے، والسلام خلیل احمد عفی عنہ ۵؍رجب ۱۳۲۵ھ۔

فروع میں دوسرا مسئلہ جس کا حوالہ اوپر آیا تھا عدت کے متعلق تھا کہ اگر عورت خاوند یا اس کے اقربا پر زبان درازی کرے تو اس کی وجہ سے اس کو گھر سے نکالا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق بھی تحریرات بہت سی اصل کتاب ''امداد الفتاوی'' میں موجود ہیں، ایسے ہی نقودِ مدرسہ

کے متعلق حضرت اقدس قطبِ عالم مولانا گنگوہی نور اللہ مرقدہ سے بھی یہی سوال کسی نے کیا تھا، حضرت گنگوہی نے اس کا جواب مرحمت فرمایا تھا جس کا ذکر ''تذکرۃ الرشید'': ۱/۱۶۴ پر ہے۔ عبارت اس کی یہ ہے:

شبہہ: مدرسے میں جو چندہ وغیرہ کا روپیہ آتا ہے وہ وقف ہے یا مملوک؟ اگر وقف ہے تو بقائے عین واجب ہے اور صرف بالاستهلاك ناجائز اور اگر مملوک ہے اور مہتمم صرف وکیل تو معطی چندہ اگر مر جائے تو غربا اور ورثا کا حق ہے اس کی تفتیش وکیل کو واجب ہے، زمانۂ شارع علیہ السلام وخلفا میں جو بیت المال تھا اس میں بھی یہ اشکال جاری ہے، بہت سوچا مگر قواعدِ شرعیہ سے حل نہیں ہوا۔ اور مختلف چندوں کو خلط کرنا استہلاک ہونا چاہیے اور مستہلک ملکِ مستہلک ہو کر جو صرف کیا جائے اس کا تبرع ہوگا اور مالکوں کا ضامن ہوگا۔ اگر یہ ہے تو اہلِ مدرسہ یا امینِ انجمن کو سخت دقت ہے، انتھی

الجواب از حضرت قطبِ عالم

مہتمم مدرسہ کا قیم ونائب جملہ طلبا کا ہوتا ہے، جیسا امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے، پس جو شی کسی نے مہتمم کو دی، مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبض سے ملکِ معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہوگیا، اگر چہ وہ مجہول الکمیہ والذوات ہوں، مگر نائب معین ہے۔ پس بعد موتِ معطی کے ملک ورثۂ معطی کی اس میں نہیں ہوسکتی، اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہوسکتا ہے۔ بہر حال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورثۂ معطی کی ہوگی اور نہ خود معطی کی ملک رہے، واللہ أعلم.

۱۰۔ متعلقہ صفحہ ۱۰: یہ بھی بہت طویل خط وکتابت ہے جو ''ترجیح الراجح'' حصہ دوم کے صفحہ: ۱۸۲ سے شروع ہو کر صفحہ: ۱۹۰ تک ۸ صفحے میں ہے، جس کی تمہید میں حضرت حکیم الامت نے لکھا ہے: مسئلة أهل الخلة في مسئلة الظلة.

بعد الحمد والصلاة

اس احقر نے مسجد پیر محمد والی کی چار سہ دریوں کے سامنے ٹین کا سائبان ڈلوایا تھا، ان میں ایک سہ دری کے سائبان کے متعلق بعض اہلِ علم سے بطور تحقیق خط وکتابت ہوئی، اس کو

اس غرض سے نقل کرتا ہوں کہ اہلِ علم سے اس باب میں مزید تحقیق کرلی جاوے اور میرے قول وفعل کو حجّت نہ سمجھا جاوے، میں نے اپنی فہم کے موافق کہا ہے اور کیا ہے، وسمیتها بما سميتها إشارة إلى الاسم السمى نواث[1] الكابر نخبة الأكبر.

(مکتوب اول آں بزرگ)

مکرم محترم سیدی ادام اللّٰہ تعالی فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ایک[2] اور مضمون کے بعد آپ کی سہ دری کے سائبان کے متعلق مجھ کو خلجان ہے، میں اس کو ناجائز سمجھ رہا ہوں اور آپ جائز۔ مولوی...... کی تقریر کچھ فہم میں نہیں آئی اس لیے مکلّف خدمت ہوں کہ مفصّل کیفیت اس کی تحریر فرماویں کہ وہ جنوبی سہ دری داخلِ مسجد ہے یا خارجِ مسجد اور مسجد کے ساتھ اس کی تعمیر ہے یا بعد میں تعمیر کی گئی یا اس کا کوئی حصّہ داخلِ مسجد ہے، بعد تفصیلی علم کے اگر خلجان رہا تو عرض کروں گا۔ (پھر ایک اور مضمون ہے) والسلام ۳۰رشوال ۱۳۳۱ھ (معروضِ احقر بجواب مکتوب اول)۔ (میرے پاس جو کاغذ ہے اس میں القاب وآداب نقل نہیں ہوئے۔ انتھی) مولوی سے جو مضمون ذکر کیا گیا تھا وہ مطول تھا اس لیے بوجہ عدمِ انضباط کے ادا نہیں کرسکے، ملخص اس کا یہ ہے کہ یہ دیوار جس پر سائبان رکھا گیا ہے جزو مسجد ہے اور سائبان بھی بقصد مصلحتِ مسجد ڈالا گیا ہے، إلخ.

مکتوب دوم بجواب معروض بالا

مکرم ومحترم دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (بعد ایک مضمون کے) سائبان مسجد کے متعلق جناب نے دو مقدمے تحریر فرمائے إلــخ. معروضِ احقر بجواب مکتوب دوم (بعد القاب وآداب کے) دیوار کو جو میں نے جزوِ مسجد لکھا تھا وہ اس بنا پر کہ وہ فرشِ مسجد پر

---

[1] یہ لفظ مختلف رسالوں میں ایسے ہی ملا، مگر اس کو ہمارے مدرسہ کے ناظم اور حضرت حکیم الامت کے اجل خلفا میں سے حضرت اقدس مولانا اسعد اللہ صاحب نے تــراث الـکـابـر پڑھا ہے اس کے معنی سلف کی میراث کے ہیں۔ [2] كذا في الأصل.

بنی ہوئی ہے، جیسا کہ حدودِ متقابلہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے گو بعد میں بنائی گئی۔ چناں چہ ایک بار میں نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی یہی شبہہ پیش کیا تھا إلخ.

مکتوب سوم بجواب معروض مذکور

مکرم ومحترم مصدر مکارم دام فضلکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ موجبِ برکت ہوا کئی روز تک تو یہ خیال رہا کہ مسئلہ کے متعلق کچھ عرض کروں یا نہ کروں مبادا تکرار موجبِ بار ہو بالآخر یہ خیال ہوا کہ اپنا خیال ایک دفعہ اور عرض کردوں، اس وقت مجھ کو دو امر عرض کرنے ہیں، ایک: تو دیوار کے متعلق کہ مسجد ہے یا نہیں، دوسرے: سائبان کے متعلق إلخ.

معروضِ احقر بجواب مکتوب سوم (بعد القاب وآداب) والا نامہ نے مشرف فرمایا، اظہارِ حق کا تکرار حاشا وکلا کہ قلب پر بار ہو اور بحمد اللہ مجھ کو تو عادت ہے کہ جب کسی امر کا حق ہونا واضح ہوجاتا ہے پھر اپنی رائے پر اصرار نہیں ہوتا، سو اب تک اسی کا انتظار ہے جو نہیں ہوا۔ اور مجھ کو بھی تکرار في الجواب خلافِ ادب معلوم ہوتا ہے، مگر تحقیق نے اس پر جری کیا إلخ

والسلام خیر الختام ۱۲رذی قعدہ ۱۳۳۱ھ تمت المکاتب

تنبیہ: گو پھر اس معروض کا جواب نہیں آیا، مگر اس جواب نہ آنے کو حجت نہ سمجھا جاوے، چوں کہ اس کا سبب کوئی عارض بھی ہوسکتا ہے، مثلاً وہی امر جو مکتوب سوم کے شروع میں مذکور ہے اس لیے اب بھی ضرورت ہے کہ اس باب میں اہلِ علم سے مزید تحقیق کرلی جاوے جیسا تمہید میں عرض کیا گیا۔ فقط

۱۱۔ صفحہ ۱۱: ''حکایات الشکایات'' حضرت حکیم الامت کی ایک مستقل تالیف ہے جو مستقل بھی چھپی ہے، مگر وہ نہیں ملی لیکن یہ مضمون ''الامداد'' بابت ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۳۶ھ سے شروع ہوا ہے، جس کی تمہید میں حضرت حکیم الامت نے لکھا ہے: بعد حمد وصلاۃ کے یہ احقر عرض رساں ہے کہ ایک مدتِ دراز سے مجھ پر عنایت فرماؤں کی طرف سے بے جا اعتراضوں کی بوچھاڑ ہے جس میں سے اکثر کا سبب تعصّب وتحزب ہے جس کے جواب

کی طرف احقر نے اس لیے کبھی التفات نہیں کیا کہ میں نے ان اعتراضوں کو قابلِ التفات نہیں سمجھا، نیز یہ بھی خیال ہوا کہ آج کل جواب دینا قاطعِ اعتراضات نہیں ہوتا بلکہ اور زیادہ مطولِ کلام ہو جاتا ہے تو وقت بھی ضائع ہوا اور غایت بھی حاصل نہیں ہوئی، تیسرے مجھ کو اس سے زیادہ اہم کام اس کثرت سے رہا کیے کہ اس کام کے لیے مجھ کو وقت بھی نہیں مل سکتا تھا۔

چوتھے میں نے جہاں تک دل کو ٹٹولا ایسے اعتراضوں کے جواب دینے میں نیت اچھی نہیں پائی، میں اہلِ خلوص کو تو کہتا نہیں مگر مجھ جیسے مغلوب النفس کی نیت تو زیادہ یہی ہوتی ہے کہ جواب نہ دینے میں معتقدین کم ہو جاویں گے، شان میں فرق آ جائے گا جس کا حاصل ارضائے عوام ہے سو طبعاً مجھ کو اس مقصود یعنی ارضائے عوام سے غیرت آتی ہے۔ باقی بعض محبین کی یہ توجیہ کہ اعتراض سے عام مسلمانوں کو بدگمانی کا گناہ ہوتا ہے تو جواب سے ان کا اس گناہ سے بچانا ہے، تامل کے بعد یہ توجیہ برائے گفتن ہی معلوم ہوئی ہے، کیوں کہ مسلمان دوسرے ہزاروں گناہوں میں مبتلا ہیں ان سے بچانے کا اس قدر اہتمام کیوں نہیں کیا جاتا؟

نیز دوسرے علمائے حقانی سے اگر ایسی ہی بدگمانی ہو جائے اس کے رفع کرنے کا وہ اہتمام نہیں ہوتا جو اپنے نفس یا اپنے کسی معتقد فیہ کے لیے ہوتا ہے، بلکہ اس قدر تو کیا، کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات تو اگر ان بزرگوں سے کچھ چشمک ہوتی ہے تو نفس میں ایک گونہ سرور پایا جاتا ہے کہ اچھا ہوا ان کی ذرا رسوائی تو ہوئی، تدین کا تو مقتضیٰ یہ تھا کہ اگر اپنے یا اپنے اکابر کے کسی مخالف سے بھی کسی کو بے جا بدگمانی ہو تو اس کے رفع کے لیے بھی ویسا ہی اہتمام ہو جیسا اپنے یا اپنے اکابر کے لیے ہوا ہے، پھر اس توجیہ کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟ اور خیر اگر اپنے کسی بزرگ کے لیے ایسا اہتمام کرے تو اس کو نصرتِ مظلوم میں بھی داخل کر سکتے ہیں جو کہ طاعت ہے، مگر اپنے نفس کے لیے ایسا کرنا تو کوئی طاعت بھی نہیں گو جائز ہو، مگر ممکن ہے کہ کسی کو بعض جائز سے بھی طبعاً انقباض ہوتا ہو۔ چوں کہ احقر کو اس سے انقباض ہوتا ہے، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گویا عوام کی خوشامد ہو رہی ہے کہ ہم سے ناراض مت ہونا، ہم کو

برامت سمجھنا، ہماری برائی تم سے غلط کہی گئی ہے، سو جہاں کوئی دنیوی ضرورت ہو وہاں تو ایسا کرنا بھی مضائقہ نہیں اور جہاں یہ بھی نہ ہو تو کیوں تعب میں پڑے؟ اور تقلیل منافعِ مالیہ یا فوتِ جاہ یہ کوئی معتد بہ ضرر نہیں جس کے لیے اتنا اہتمام کیا جائے، یہ ہے میرا مذاق اس امر میں، پس ان وجوہ سے میں نے اس کا کبھی قصد نہیں کیا اور نہ اپنے مخصوصین کو اس کی اجازت دی۔ ہاں! اگر کسی محض بے تعلق شخص نے بدون مجھ سے مشورہ لیے ہوئے کبھی جواب دے دیا تو نفس کو سرور ضرور ہوا، مگر پوچھنے پر مشورہ بھی کسی کو نہیں دیا۔

لیکن آج کل بعضے نئے اعتراضات سن کر خصوص رسائل الامداد بابت شہورِ اولیہ سن رواں کے مضامین کے متعلق یا بعضے پرانے اعتراضوں کا اعادہ سن کر قلب میں ایک نیا خیال یہ پیدا ہوا کہ ممکن ہے کہ بعض معتقدین وموافقین کو اب تک ان اعتراضوں کا علم نہ ہوا اور اس لیے وہ معتقد ہوں اور اگر علم ہو جاتا تو معتقد نہ رہتے تو گویا زمانہ بقائے عقیدت تک وہ دھوکے میں رہے اور مسلمانوں کو دھوکے سے بچانا ضروری ہے، جیسا کسی تاجر کے سودے میں کوئی کھوٹ ہو تو ظاہر کر دینا ضروری ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ چند ایسے اعتراضات کو نقل کر کے اپنے نزدیک جو اِن کی حقیقت ہے اس کو بھی لکھ دیا جاوے، تاکہ دیکھنے والے دونوں کو دیکھ لیں، پھر جس کا جی چاہے احقر سے تعلّق پیدا کرے یا رکھے اور جس کا جی چاہے تعلّق نہ کرے یا نہ رکھے۔ ضمناً یہ بھی مصلحت ذہن میں آئی کہ بعض لوگ واقعی طالبِ حق ہوتے ہیں اور اصل قصّہ معلوم نہ ہونے یا اس کی حقیقت نہ سمجھنے سے تردد میں پڑ جاتے ہیں اور وہ خلوص کے ساتھ تردد رفع کرنا چاہتے ہیں، ایسوں کا تردد رفع کرنا ہدایت کا ایک شعبہ ہے جو کہ طاعت ہے سو ساتھ ساتھ یہ طاعت بھی ادا ہو جاوے گی۔

پس اس عجالۂ مختصرہ میں ان مضامین کو اس ترتیب سے لکھا جاوے گا کہ اول ایک وہ مضمون جو مبنیٰ ہے اعتراض کا بعنوان ''حکایت'' لکھوں گا، پھر معترض کے اعتراض کو بعنوان ''شکایت'' نقل کروں گا، پھر اپنے نزدیک جو اس کی حقیقتِ واقعیہ ہے بعنوان ''درایت'' لکھ کر ختم کردوں گا۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ ان شبہات سے کوئی مفسدہ ہوا بھی نہیں، چناں چہ خطبہ کے

آخری نوٹ نمبر ۱ میں مذکور ہے اور خود حاجت نہ ہونا بھی مسلم نہیں، رفعِ شبہات و تصحیحِ اعمال وعقائد اعظم حاجت ہے، مثلاً: حکایت متضمنہ خواب مندرجہ رسالہ صفر حکایت سوم میں وجہ حاجت نہایت ظاہر ہے کہ اگر کسی اہلِ حال کو ایسا امر پیش آوے تو وہ غلطیِ اعتقاد یا پریشانی وتو ہمِ مطرودیت سے بچا رہے۔ اس سے وہ شبہہ بھی دفع ہو گیا جو بعض خیر خواہوں کو جواب نہ دینے کے متعلق واقع ہوا کہ اپنے سے رفعِ تہمت کرنا سنت بھی تو ہے، جیسا حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے واقعۂ اعتکاف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

وجہ جواب ظاہر ہے کہ یہ سنت بھی اس امر میں ہے جو محلِ اشتباہ ہو اور جب یہ نہیں تو احتمالات غیر ناشی عن دلیل کا کہاں تک انسداد کیا جاوے۔ مجھ کو اس وقت اپنی تین حالتیں پیشِ نظر ہیں، ایک: محبین کی ملامت اور مخالفین کا اعتراض، دوسرے: ان سب اعتراضوں کو جن کو دوسرا عیب جو مدتوں میں چھانٹتا از خود ایک جگہ جمع کر دینا، تیسرے: اس جمع کرنے میں یہ نیت کہ جس کا جی چاہے تعلق رکھے جس کا جی چاہے نہ رکھے۔ ان تینوں حالتوں پر تین شعر بے ساختہ ذہن میں آئے ہیں، اول کے متعلق مومن خاں کا یہ شعر:

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں

ثانی کے متعلق اسی غزل کا دوسرا شعر:

میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

ثالث کے متعلق غالب کا شعر بتصرف یسیر:

ہاں وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

وأفوض أمري إلى الله إن الله بصير بالعباد، قل يجمع بيننا ربنا ثم يفتح

بيننا بالحق وهو الفتاح العليم.

نوٹ ا: ممکن ہے کہ ان مضامین کی تحریر یا تدوین میں کوئی عمل کسی مناسب رائے کے خلاف واقع ہوگیا ہو، مگر بحمد اللہ! دین کے خلاف کچھ نہیں ہے، نیز ان مضامین سے جو کچھ تشویش عوام میں ہوئی اس کا حاصل مجھ کو سب وشتم کرنا تھا، بحمد اللہ کسی مقصودِ دینی میں کوئی اختلال واقع نہیں ہوا، سو اپنے سب وشتم کو باُمید عفوِ حق سب کو معاف کرتا ہوں۔

نوٹ ۲: بندے نے آیندہ کے لیے ایک کافی جماعت اہلِ علم ودیانت کی اس کام کے لیے مخصوص کردی ہے کہ میری تمام تحریرات کو نظرِ تنقید سے دیکھ لیا کرے جو ان کی رائے میں قابلِ اشاعت نہ ہوں ان کو یا حذف کردیں یا ان پر نشان بنادیں، تاکہ ان کو کوئی شائع نہ کرے، باقی اگر کوئی خاص مکتوب الیہ کسی خاص مضمون کا جواب بطور خود بدون یہاں کے علم کے شائع کردے تو وہ اختیار سے خارج ہے، اب اگر کوئی مضمون جو ناظرین کے نزدیک وہم ہو یہاں سے شائع ہو تو اس کے متعلق خط وکتابت بجائے میرے، بنام جماعت ''انتخاب التالیفات'' بہ نشان تھانہ بھون فرمانا مناسب ہے۔

نوٹ ۳: جس طرح ''ترجیح الراجح'' کا سلسلۂ شبہات محتمل الصحت کے لیے جاری ہے ایسا ہی اگر موقع ہوا تو شبہات غیر محتمل الصحت کے لیے اس ''حکایات الشکایات'' کا بھی سلسلہ جاری رہنا محتمل ہے۔ والأمر كله بيد الله۔

نوٹ ۴: اس وقت ایسے شبہات چھ ہیں، تین مخالفین کی طرف سے، تین احباب کی طرف سے جن میں دو اوسط کے مجھ پر زیادہ شاق ہوئے ہیں، جن کے شاق ہونے کی وجہ درایت متعلقہ حکایت: ۴ میں مرقوم ہے۔ کتبہ اشرف علی تھانوی عفی اللہ عنہ آخر جمادی الاولی ۱۳۳۶ھ۔

اس کے بعد جام مذکور میں حکایت: ۴ کے متعلق ذکر فرمایا ہے وہ ''الامداد'' بابت ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۳۶ھ میں حسبِ ذیل مذکور ہے۔ حکایت: ۴ ایک شخص کا خواب مع تعبیر جو بعنوان ''سوال وجواب'' ذیل میں منقول ہے۔

سوال: ۱۴؍ر جمادی الاخری روزِ جمعہ بوقت شب خواب میں احقر نے حضور مقبول ﷺ کو دیکھا، آپ نے فرمایا کہ شاہ صاحب! مولانا صاحب شیخِ کامل ہیں، حضور ﷺ نے آپ کے نام میں مولوی کہہ کے سکوت فرمایا، بعد کو غالباً دومنٹ سکوت فرما کے لفظ ''صاحب'' کہا اور ''شاہ صاحب'' صاف فرما گئے بیچ میں سکوت نہ کیا، نہ معلوم وجہ سکوت کیا ہے؟ جو کچھ تعبیر ہو مطلع فرمایا جاوے۔

الجواب: عن عائشة رضي الله عنها قالت: كان رسول ﷺ مضطجعا في بيته، كاشفا عن فخذيه أو ساقيه، فاستأذن أبو بكر رضي الله عنه فأذن له، وهو على تلك الحال فتحدث، ثم استاذن عمر رضي الله عنه فأذن له، وهو كذلك فتحدث، ثم استأذن عثمان رضي الله عنه فجلس رسول الله ﷺ وسوى ثيابه (إلى قوله) قال: إن عثمان رجل حيي وأني خشيت إن أذنت له على تلك الحالة أن لايبلغ إلي في حاجته. رواه مسلم. (مشکوٰۃ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جناب رسول ﷺ کا یہ طرز تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر صفتِ حیا ولحاظ کے غلبہ سے آپ نے ان کے ساتھ برتاؤ کا لحاظ کیا اور شیخین کے ساتھ بے تکلفی کا برتاؤ کیا اور لفظِ صاحب ہمارے محاورہ میں لحاظ کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔ سو جن صاحب کے نام کے ساتھ حضور ﷺ نے لفظِ صاحب فرمایا ہے ان میں اس شانِ عثمانی کا غلبہ مشاہد ہے اور جس کے نام کے ساتھ یہ لفظ فوراً نہیں فرمایا اس سے شیخین کا سا برتاؤ کیا اور پھر وقفے کے بعد ''صاحب'' کا لفظ فرمانا یہ مخاطب کی رعایت کی مصلحت سے ہے کہ وہ خالی نام لینے سے بے وقعتی اس نام والے کی نہ کرے، آگے اللہ کو معلوم ہے کیا راز ہے۔ بہتر یہ ہوتا کہ کسی ایسے شخص سے تعبیر پوچھی جاتی جو خواب کے تعلق والوں سے علیحدہ ہوتا اور محقق بھی ہوتا، والسلام۔

مکرر یہ ہے کہ محض اس خواب کی بنا پر کسی کے کمال وغیرہ کے معتقد نہ ہوں کہ خواب حجّتِ شرعیہ نہیں ہے، حالتِ بیداری میں جس کی حالت کو شریعت پر پورا منطبق دیکھیں اس کو کامل سمجھیں، والسلام۔

شکایت: ایک صاحب کا خط آیا جو کہ بعینہ محفوظ نہیں، مگر خلاصہ اس کا یہ تھا کہ اس کی یہ تعبیر نہیں،

بلکہ ایک نام کے ساتھ لفظِ صاحب فوراً نہ کہنا اس وجہ سے ہے کہ اس نام کا مسمّیٰ ایک زمانے میں بعض مسائل میں اختلاف رکھتا تھا۔ اور یہ بھی لکھا تھا کہ یہ جو آخر جواب میں لکھا ہے ''یہ محض اس خواب کی بنا پر الخ'' اس میں صاحبِ تعبیر نے دوسرے صاحب کی بزرگی پر حملہ کیا ہے۔ انتهى بخلاصته.

درایت: یہاں سے جو جواب گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ یہی تعبیر صحیح ہو جو آپ نے لکھی ہے مجھ کو اپنی تعبیر پر کہ تعبیر ظنی ہوتی ہے اصرار نہیں اور حملے کے مضمون کا حاشا وکلا میرے قلب میں وسوسہ بھی نہیں۔ ایک قاعدہ کلیہ شرعیہ نفع طالبین کے لیے لکھ دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے کام آوے، انتهى.

اسی طرح ایک روایت مجھ کو ایک ثقہ دل سوز سے بایں الفاظ پہنچی ''سنا ہے کہ ''الامداد'' میں حضرت قدس سرہٗ کی نسبت بھی کچھ ابہامات طباعت ہو گئے ہیں، میں خوب جانتا ہوں کہ حضرت کا دل استخفاف کے خطرے سے بھی پاک ہے، مگر سنتا ہوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین و منتسبین کو گرانی ہو رہی ہے اور دور دور تک نوبت پہنچ گئی ہے، میں نے تو خود ''الامداد'' دیکھا نہیں، سنا ہے کہ حضرت امام غزالی علیہ الرحمۃ کی کتاب الزہد کا تذکرہ اور اس پر حضرت کا کوئی قول مذکور ہے۔

اسی طرح یہ سنا ہے کہ مولوی صاحب کا کوئی خط اور آپ کی طرف سے اس کا جواب ''الامداد'' میں طبع ہوا ہے، اس کے عنوان میں کچھ ایسے الفاظ لکھے گئے ہیں جن سے مولانا صاحب مدظلہ کی طرف بھی اشارہ ہے انتهى اور واقعی یہ شکایتیں جو اس حکایت میں ہیں اسی طرح جو اس سے پہلی حکایت میں ہے مجھ پر سب سے زیادہ أشد و أشق اس لیے ہے کہ جس ذات مقدسہ کے ساتھ غلامی کی نسبت کو اولاً و بالذات اپنے ایمان کا مدار قطعاً اور جن اکابر کے ساتھ محبت وعقیدت کو ثانیاً و بالعرض اپنے کمال نجات میں مؤثر ظناً اعتقاد رکھوں، نعوذ باللہ! ان ہی کی شانِ مبارک میں مجھ کو گستاخ بتایا جاوے اور گستاخی بھی وہ جس کی مجھ کو خواب میں بھی ہوا نہ لگی ہو۔

حکایتِ سابقہ [۱] کی درایت تو اوپر گذر چکی اور اس حکایت کی درایت کے لیے میری تقریرات وتحریرات کے غیر محدود وغیر معدود مضامین کافی ہیں، نمونے کے لیے بعض اقل قلیل کا پتا عرض کرتا ہوں ملاحظہ ہو، الظہور، صفحہ: ۴۵ اور رسالہ ''یادِ یاراں'' تمام اور ''الامداد'' بابت صفر ۱۳۳۶ھ صفحہ: ۲۹ اور صفحہ: ۳۰ اور صفحہ: ۳۱، جس میں ان مذکورہ بالا مولوی صاحب کا بھی ایک کلام ضمناً مذکور ہے اور وعظ فوائد الصحبۃ در مجموعہ اشرف المواعظ کلاں [۱] حصّہ اول مطبوعہ ساڈھورہ صفحہ: ۵۴ اور صفحہ: ۵۵ اور تنبیہات وصیّت میں فہرست صالحین للبیعہ اور مسودہ وعظ فضل العابد بیان کردہ ربیع الثانی، جس میں شیخین کبیرین مصداق یکساں دونوں کی تفصیل بعض وجوہ سے حضرت شیخ العرب والعجم رحمۃ اللہ علیہ پر منصوص ہے۔

اگر تتبع کیا جاوے تو بکثرت ایسے مقامات ملیں گے جن میں فضائل ان اجلہ کے مصرح ہیں، امام غزالی کی کتاب الزہد کے متعلق جس مضمون کا مجھ پر شبہہ کیا گیا ہے مجھ کو اولاً دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ اے اللہ! یہ کیا قصّہ ہے؟ میں نے اپنے ذہن میں اس کا کوئی وجود نہیں پایا۔ لیکن احتیاطاً اپنا کلام ٹٹولنا شروع کیا تو اتفاق سے وہ مقام مل گیا، دیکھا تو اس میں کسی بزرگ کا نام تک نہیں ہے صرف لفظ ''ایک شیخ'' لکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس کی تفسیر کس دلیل سے خود کرلی گئی ہے، میں نے بہت سوچا۔ بہت پرانی بات ہے، خوب محفوظ نہیں، لیکن دو امر پر حلف کرتا ہوں: ایک یہ کہ میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مضمون نہیں سنا، کسی ایسے شخص سے سنا ہے جس کا مقصود اس قول سے اپنی کم ہمتی کے لیے ایک سہارا ڈھونڈنا ہے، مگر مجھ کو اس شخص کی تعیین یاد نہیں رہی۔ دوسرے اس پر حلف کرتا ہوں کہ مقصود اس سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر نکیر نہیں۔

---

[۱] خوانِ خلیل میں یہ حکایت آگے آرہی ہے۔ اور ''حکایات الشکایات'' میں وہ پہلے آچکی ہے، اس لیے سابقہ فرمایا گیا۔

[۱] یہ سلسلہ میرے والدِ محترم حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شروع کیا تھا، ہر ماہ ایک سو ساٹھ صفحات کا مجموعہ حضرت حکیم الامت کے مواعظ کا شائع فرماتے تھے اور قیمت صرف چار آنے تھی جو اس کی پڑت سے بھی کم تھے اور اس کے مستقل خریدار ماہوار رسالوں کی طرح سے سینکڑوں ہوگئے تھے۔ اور کلاں کا لفظ اس لیے بڑھایا گیا تھا کہ اس نام کا ایک مختصر سا وعظ حضرت حکیم الامت کا پہلے شائع ہوچکا تھا۔

باقی جس عنوان کا ذکر اُس دل سوز کے کلام میں ہے اس عنوان کے الفاظ مجاز یکے شیخِ طریقت أو نحوہ ہیں، سو اول تو یہ الفاظ معلوم نہیں کہ کس کے ہیں، لیکن جس کے بھی ہوں میرے ذہن میں جو اس کے معنی متبادر طور پر اولاً آئے وہ یہ ہیں کہ باوجود درجۂ مجازیت کے بھی انسان سے لغزش ہوسکتی ہے تو اہلِ کمال کو بھی اپنی اصلاح سے غافل نہ ہونا چاہیے تو مجازیت اس درجہ کا عنوان ہے کہ نعوذ باللہ! ان شیخ کی تنقیص کہ ایسے کو کیوں مجاز بنایا؟ اس کی بہت سی نظیریں خود اپنے مجازین کے متعلق جا بجا تحریرات میں منضبط ہیں، چناں چہ اس وقت ایک موقع نظر کے سامنے بھی ہے: ''الامداد'' بابت محرم ۳۶ھ صفحہ: ۲۱ کہ اس میں ایک صاحب، پر جن کے مجاز ہونے کی عبارت میں بھی تصریح ہے، کس قدر لتاڑ پڑی ہے۔ اس مقام پر ظاہر ہے کہ یہی مقصود ہے کہ مجاز ہو کر بھی بے فکر نہ ہونا چاہیے کہ اس حالت میں بھی خطائیں صادر ہوسکتی ہیں۔

روایت: احقر نے اس درایت کے مضمون کا خلاصہ اپنی جماعت کے بعض حضرات اکابر کی خدمت میں (جو لباسِ خلۂ احمدیہ سے پیراستہ ہیں) عرض کیا تھا، اس کا جواب بخامۂ عنایت جو ارشاد فرمایا اور اصاغر کو جس کی توقع اکابر سے ہوتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے: معلوم نہیں کہ لوگوں کو کیا مزہ آتا ہے کہ غلط روایتیں پہنچا کر اہلِ خیر کے قلوب کو دُکھاتے ہیں۔ (یہ خط بعینہٖ خوانِ خلیل میں آچکا ہے اس لیے خلاصہ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی) ہر چند کہ اس تحریر کے بعد بوجہ حصولِ طمانیت کے اس مضمونِ درایت کی حاجت نہ رہتی، خصوص اس کے بعد جب کہ بفضلہٖ تعالیٰ مشافہتاً بھی ہر پہلو سے اطمینان اور ایقان حاصل و کامل ہوگیا۔ لیکن دو خیال سے اس کو باقی رکھا گیا، ایک یہ کہ بہت قریب احتمال ہے کہ بعض کو اس درایت کے مضمون کا علم نہ ہونے سے کچھ وساوس باقی رہتے، دوسرے یہ کہ اس کے ضمن میں میرا اعتقاد جو اپنے اکابر کے ساتھ ہے اس کا علم میرے تمام متعلقین کو بھی صریحاً و مقصوداً ہو جاوے، تاکہ مرورِ زمانہ پر بھی ان میں اس کا تغیر محتمل نہ رہے، فقط۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے الامداد محرم ۳۶ھ صفحہ: ۲۱ کا جو حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

''ملفوظات ۲۲: ایک صاحب نے جو مولوی اور مجاز تھے ایک عریضہ لکھ کر خدمت والا میں

پیش کیا، جس میں یہ مضمون تھا کہ میں اپنے وطن جاتا ہوں اور وہاں فتنے بہت ہیں، آپ کچھ فرما دیجیے تا کہ مجھے اطمینان ہو جاوے، فرمایا کہ میں کیا کہہ دوں؟ ان صاحب نے ا پہلے اس کو جانتے ہیں، پھر مجھ سے یہ لفظ کیوں کہلایا جاتا ہے؟ پھر فرمایا کہ میرے سامنے سے دور ہو جاؤ، تم کو بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آیا، اگر دعا کرانی تھی تو صاف لفظوں میں کہا ہوتا کہ دعا کر دیجیے (اس کے بعد ایک صاحب نے ان صاحب کی سفارش کرنی شروع کی تو ان پر بھی لتاڑ پڑی، ''الامداد'' میں مفصّل موجود ہے) اور اس درایت کے درمیان میں ''الامداد'' بابت صفر ۳۶ھ صفحہ: ۲۹، ۳۰، ۳۱ کا جو حوالہ دیا تھا اس میں حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہما کے تین قصّے تفصیل سے ذکر فرمائے ہیں، اول قصہ اس مسئلے میں ہے کہ مجھے اس میں تردد تھا کہ جمعہ کے بارے میں فقہا نے قصبہ کو مصر کے حکم میں کیسے قرار دیا؟ جب کہ حدیث میں صرف مصر کا لفظ ہے اور قصبہ شہر ہے نہیں، پھر لفظِ مصر قصبہ کو کیسے شامل ہوا؟ سو یہ تردد ایک حکایت سن کر رفع ہوا۔

وہ یہ کہ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ ایک مرتبہ ایامِ طالب علمی میں گنگوہ کو آتے ہوئے قصبہ تیتروں کے برابر پہنچے تو کسی عامی سے پوچھا کہ یہ گاؤں کون ہے؟ وہ گنوار بولا: ارے! تو کون ہے؟ شہر کو گاؤں کہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شہر غیر گاؤں کو کہتے ہیں اور لغت میں قصبہ کا کوئی جدا نام نہیں، اس میں دو ہی لغت مستعمل ہیں: ایک قریہ اور ایک مصر۔ مجھے یہ روایت پہنچی کہ حضرت گنگوہی کو بھی یہی تردد تھا، مگر جب حضرت ایک قصبہ میں پہنچے جہاں لوگ آپ کو پہچانتے نہ تھے وہاں آپ نے دریافت کیا کہ یہ کون سا گاؤں ہے؟ جواب ملا کہ تجھے سوجھتا نہیں یہ تو شہر ہے، اس وقت حضرت کو بھی شفائے قلب ہوگئی کہ عوام قصبہ کو بھی شہر کہتے ہیں۔

دوسرا واقعہ حضرت نانوتوی کا لکھا ہے کہ اپنے صاحب زادے کے کپڑے کی گٹھڑی منگا کر دیکھی تو اس میں کپڑے کسی قدر تکلف کے تھے اور گٹھڑی جام دانی کی تھی۔ حضرت ان کو دیکھ کر بہت نفرت کے ساتھ سب کو پھینک رہے تھے اور زجر فرماتے تھے۔ حضرت بہت بڑے زاہد

تھے۔ اس کے بعد تیسرا واقعہ حضرت گنگوہی کا یہ تحریر فرمایا کہ گنگوہ میں خانقاہ کی مسجد کو لوگوں نے تیار کرنا چاہا، حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ نے لوگوں سے صاف کہہ دیا کہ بھائی! میرے بھروسے کوئی کام نہ کرنا کہ میں چندہ وصول کرانے میں سعی کروں گا۔ (طویل قصہ ہے)

۱۲۔ متعلقہ صفحہ ۱۱: حکایت: ۳ ایک صالح ذی علم نے اپنی حالتِ باطنیہ لکھی تھی۔ یہاں سے اس کی تحقیق کی گئی تھی، وہ ذیل میں منقول ہے۔

سوال: اب وجہ اس کی عرض کرتا ہوں کہ بیعت ہونے کا خیال مجھ کو کیوں ہوا، اور حضور کی طرف کیوں رجوع کیا۔

۱۔ بیعت کا شوق صرف مطالعۂ کتبِ تصوف سے اور حضور کی جانب رجوع اس لیے کہ ہمارے نانا صاحبان ...... لودھیانہ والوں سے حضور کے اعتقادات ملتے جلتے تھے، اس سے یہ غرض نہیں کہ ہمارے نانا یا اور کوئی اپنے دادا و غیرہ علما کے اعتقادات گو خراب ہی ہوں ان کو بلا وجہ ترجیح دی جاوے، اصل غرض یہ ہے کہ حضور کے اور بندے کے اعتقادات بالکل ایک ہیں، اور اگر مولوی صاحبان لودھیانوی اور حضور کے درمیان اگر کسی فروعات میں اختلاف بھی ہو تو اس میں بھی جناب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

۲۔ اور حضور کی تصنیف چند کتابیں زیرِ مطالعہ رہی ہیں، جن میں سے ''بہشتی زیور'' تو حرزِ جان ہے ...... کچھ عرصے کے بعد خواب دیکھتا ہوں کہ کلمہ شریف لا إلہ إلا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ پڑھتا ہوں، لیکن محمد رسول اللّٰہ کی جگہ ...... کا نام لیتا ہوں، اتنے میں دل کے اندر خیال پیدا ہوا کہ تجھ سے غلطی ہوئی کلمہ شریف کے پڑھنے میں، اس کو صحیح پڑھنا چاہیے اس خیال سے دوبارہ کلمہ شریف پڑھتا ہوں، دل پر تو یہ ہے کہ صحیح پڑھا جاوے، لیکن زبان سے بے ساختہ بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ...... نکل جاتا ہے، حالاں کہ مجھ کو اس بات کا علم ہے کہ اس طرح درست نہیں، لیکن بے اختیار زبان سے یہی کلمہ نکلتا ہے، دو تین بار جب یہی صورت ہوئی تو حضور کو اپنے سامنے دیکھتا ہوں اور بھی چند شخص حضور کے پاس تھے، لیکن اتنے میں میری یہ حالت ہوگئی کہ کھڑا کھڑا بوجہ اس کے کہ رقت

طاری ہوگئی زمین پر گر گیا اور نہایت زور سے ایک چیخ ماری اور مجھ کو معلوم ہوتا تھا کہ میرے اندر کوئی طاقت باقی نہیں رہی اتنے میں بندہ خواب سے بیدار ہوگیا، لیکن بدن میں بدستور بے حسی تھی اور وہ اثر ناطاقتی بدستور تھا۔

لیکن حالتِ خواب اور بیداری میں حضور کا خیال تھا، لیکن حالتِ بیداری میں کلمہ شریف کی غلطی پر جب خیال آیا تو اس بات کا ارادہ ہوا کہ اس خیال کو دل سے دور کیا جاوے اس واسطے کہ پھر کوئی ایسی غلطی نہ ہو جاوے، بایں خیال بندہ بیٹھ گیا اور پھر دوسری کروٹ لیٹ کر کلمہ شریف کی غلطی کے تدارک میں رسول اللہ ﷺ پر درود شریف پڑھتا ہوں، لیکن پھر بھی یہی کہتا ہوں اللھم صل علی سیدنا و نبینا و مولانا ...... حالاں کہ اب بیدار ہوں خواب نہیں، لیکن بے اختیار ہوں مجبور ہوں، زبان اپنے قابو میں نہیں۔ اس روز ایسا ہی کچھ خیال رہا تو دوسرے روز بیداری میں رقت رہی خوب رویا۔ اور بھی بہت سے وجوہات ہیں جو حضور کے ساتھ باعثِ محبّت ہیں کہاں تک عرض کروں۔

جواب: اس واقعہ میں تسلّی تھی کہ جس کی طرف تم رجوع کرتے ہو وہ بعونہ تعالیٰ متبعِ سنت ہے۔

۲۴ رشوال ۱۳۳۵ھ یہ خواب اور اس کا مفصّل جواب ''الامداد'' ۱۳۳۶ھ میں مذکور ہے۔

شکایت مع درایت: اس واقعہ کے متعلق اور اس پر جو میرا جواب ہے اس کے متعلق جو کچھ شورش برپا ہوئی، جس میں زیادہ حصّہ بعض اخباروں نے لیا اس کا حاصل پانچ الزام ہیں، اول: یہ کہ نعوذ باللہ! مجیب نے دعویٰ نبوت کا کیا أستغفر اللّٰه! نعوذ باللّٰه! لاحول ولا قوة إلا باللّٰه. دوسرے: یہ کہ صاحب واقعہ پر زجر و توبیخ اور اس کو استغفار کا امر نہیں کیا، کیوں کہ یہ وسوسہ شیطانی تھا یا کم از کم یہ واقعہ طبیعت پر گراں کیوں نہیں ہوا۔ تیسرے: یہ کہ جب یہ وسوسہ شیطانی تھا تو اس کو حالت محمودہ کیوں سمجھا گیا؟ جیسا کہ اس کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے، چوتھے: یہ کہ صاحبِ واقعہ کو تجدید ایمان وتجدید نکاح کا حکم کیوں نہیں دیا؟ پانچویں: یہ کہ اس تحریر کو شائع کیوں کیا گیا جس سے اتنا مفسدہ ہوا؟

الزامِ اول کا افترا و بہتانِ عظیم ہونا اس قدر ظاہر ہے کہ بجز اس کے کہ اس آیت مبارک

کی تلاوت کردوں اور زیادہ جواب دیتے ہوئے بھی غیرت آتی ہے۔ آیۃ. ﴿والّذین یؤذون المؤمنین والمؤمنٰت بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بہتانا واثما مبینا۝﴾[1] کیوں کہ عبارتِ جواب میں اول سے آخر تک ایک لفظ بھی اس دعوے پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ جواب میں لفظ تتبعِ سنت خود اعتراف ہے کہ مجیب کو حضور اقدس ﷺ کے ساتھ غلامی کی نسبت ہے۔ پس اس الزام والوں کے لیے آیتِ موصوفہ کی وعید ہی کافی ہے، مگر چوں کہ دنیا میں ایسے بھی غبی ہیں کہ وہ اس سے زیادہ واضح جواب کے محتاج ہیں اس لیے اتنا اور عرض کرتا ہوں کہ غور کرنا چاہیے کہ اگر یہی واقعہ اس زمانہ کے مشہور مدعیِ نبوت کے سامنے پیش ہوتا تو کیا وہ اس کا یہی جواب دیتا جو احقر نے دیا ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ وہ تو یوں کہتا کہ تمہارا مجھ کو رسول نہ سمجھنا اور اس بنا پر ان الفاظ کو غلط جان کر فکرِ تدارک کرنا تمہاری غلطی ہے اور میں واقع میں رسول ہوں۔ اور یہ کہتا کہ اس سے بڑھ کر میری رسالت کی کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ تم باوجود یہ کہ میری رسالت کا اقرار کرنا نہیں چاہتے، مگر خدا تعالیٰ تم سے جبراً اس کا اقرار کراتا ہے، انتھی.

اب موازنہ کرکے بتایئے کہ احقر کے جواب میں نعوذ باللہ! دعویٰ تو درکنار کہیں اس کا شبہہ بھی ہے؟ حاشا وکلا! اگر یہ قصداً افترا نہیں بلکہ بدفہمی ہے تو اگر اس کی کوئی بنا بھی ہے جیسے بعض کا قول سنا گیا ہے کہ صاحبِ واقعہ کے اس مضمون کے نقل کرنے پر رد نہ کرنا اس مضمون کی تقریر ہے تو موٹی بات ہے جب صاحبِ واقعہ خود ہی اس مضمون کے رد و ابطال کو بھی نقل کررہا ہے تو پھر مجیب کو اس کی کیا حاجت رہی؟ تو مجیب کا سکوت فی الواقع اس صاحبِ واقعہ کے اس رد و ابطال کی تقریر ہے نہ کہ اس مضمون کی، پھر یہ بنا کیا چیز رہی اور اگر بلا کسی بنا کے یہ بدفہمی ہے تو بس اس آیت کا مصداق ہے آیۃ. ﴿فانّہا لا تعمی الابصار ولٰکن تعمی القلوب الّتی فی الصّدور﴾[2] اللہ تعالیٰ فہم و تدین عطا فرمائے۔

غرض اس الزام کا منشا تو جہلِ محض یا عنادِ بحت ہے۔ رہے بقیہ الزامات، سو اصل یہ ہے کہ اس واقعہ کے دو جزو ہیں: ایک خواب کا، ایک بیداری کا۔ سو ظاہر ہے کہ حصۂ خواب میں وہ

---

[1] احزاب: ۵۸ [2] حج: ۴۶

بالیقین وبالاجماع مکلّف تو ہے نہیں، مگر تاہم اس میں فی نفسہٖ چند احتمال ہیں۔ ایک: یہ کہ یہ خواب گو صورتاً منکر وقبیح ہے، مگر نظر بر صلاحِ حالِ صاحبِ رویا تعبیر اس کی اچھی ہو، چوں کہ صاحبِ رویا کی حالت کو تعبیر میں دخل ہوتا ہے جیسا حدیث میں قصّہ آیا ہے کہ امِ فضل نے حضور ﷺ کی خدمت میں یہ خواب عرض کیا: كأن قطعة من جسدك قطعت ووضعت في حجري اور ساتھ ہی یہ عرض کیا تھا: رأيت حلما منكرا الليلة، مگر آپ نے یہ فرمایا کہ رأيت خيرًا اور پھر ایک اچھی تعبیر دی،[1] حالاں کہ ظاہراً کیا بے ادبی کا واقعہ دیکھا اور جیسا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خواب دیکھا: أنه أتى قبر رسول الله ﷺ فنبشه فأخبر أستاذه، وكان أبو حنيفة صبيا بالمكتب، فقال له أستاذه: أن صدقت رؤياك يا ولد، فإنك تقتفي أثر رسول الله ﷺ وتنبش عن شريعته، فكان كما عبر الأستاذ.[2] اسی طرح علامہ خطیب نے اپنی تاریخ میں بتغییر بعض الفاظ یہ واقعہ درج فرمایا ہے (من رسالة بعض الاحباب) دیکھیے یہ خواب ظاہراً کیسا موحش تھا، لیکن تعبیر کیسی تسلّی بخش بتلائی گئی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خواب شیطانی ہو اور اس کی تعبیر اچھی نہ ہو، سو احقر کا ذہن جواب لکھنے کے وقت اس احتمالِ اول کے طرف گیا اور گو میں صاحبِ واقعہ کو نہ پہچانتا ہوں، نہ جانتا ہوں، کیوں کہ نہ وہ میرا مرید ہے، نہ کچھ خط وکتابت یا تعلیم وتلقین کا کوئی تعلق مجھ کو یاد ہے، مگر بعض قرائن قصّہ سے میرے قلب نے اس کے صلاح کی شہادت دی، جن میں بڑا قرینہ غلط کلمات کے نکلنے سے اس کا خواب میں بھی پریشان ہونا اور اس کے تدارک کی کوشش کرنا ہے، کیوں کہ خواب میں آدمی مکلّف نہیں ہوتا، مگر باوجود عدمِ تکلیف کی حالت میں ہونے کے امر و نہی کا ایسا اہتمام ہونا بین دلیل ہے صاحب رویا کے ایمان قوی وصلاح کی، پس اسی صلاح وتدین کی بنا پر میں نے اس کی ایک اچھی تعبیر لکھ دی اور اس وقت وجہِ مناسبت کا نہ لکھنا ایک: تو اس لیے تھا کہ میں اس کو اپنے نزدیک خفی نہیں سمجھا۔ دوسرے اس لیے کہ مخاطب میرے گمان میں صاحبِ علم یا صاحب فہم تھا۔ اس کی حاجت نہ سمجھی، تیسرے تعبیر کے ساتھ وجہِ

[1] مشکوٰۃ باب مناقب اہل البیت۔ [2] رسالہ تعبیر الرویا کشوری: صفحہ: ۳۷۔

مناسبت لکھنا ضروری بھی نہیں، جیسا حکمِ شرعی کے ساتھ دلیل لکھنا ضروری نہیں، مگر اب تبرعاً وجہِ مناسبت بھی لکھتا ہوں اور وہ یہ کہ بعض اوقات خواب میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور دل بھی گواہی دیتا ہے کہ حضور ہی ہیں، لیکن زیارت کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ شکل کسی اور شخص کی ہے تو وہاں اہلِ تعبیر یہی کہتے ہیں کہ یہ اشارہ ہے اس شخص کے متبعِ سنت ہونے کی طرف، پس جس طرح یہاں بجائے شکلِ نبوی کے دوسری شکل مرئی ہونے کی تعبیر ''اتباع'' سے دی گئی اسی طرح بجائے اسمِ نبوی ﷺ کے دوسرا اسم ملفوظ ہونے کی تعبیر اگر اس اتباع سے دی جائے تو اس میں کیا محذورِ شرعی لازم آ گیا؟ نیز مناسبت کی تقریر علمی اصطلاح کے موافق یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تشبیہ بلیغ میں اداۃِ تشبیہ حذف کر دیا جاتا ہے، جیسے ابو یوسف ابو حنیفہ اور تعبیر کے لیے ادنیٰ مناسبت بھی کافی ہے۔ باقی مجھ کو اس پر اصرار نہیں، اگر یہ خواب شیطانی ہو یا کسی مرضِ دماغی سے ناشی ہوا ہو اور اس کی یہ تعبیر نہ ہو یہ ممکن ہے، لیکن غلط تعبیر دے دینا ایک وجدان کی غلطی ہوگی، جس پر کوئی الزام نہیں ہوسکتا۔

یہ تو کلام تھا حصۂ خواب کے متعلق، اب رہا حصۂ بیداری کا جس میں غلط کلمات نکل رہے ہیں سو صاحبِ واقعہ تصریحاً کہتا ہے کہ میں بقصد تلافی کلمات خواب کے صحیح کلمات ادا کرنا چاہتا ہوں، مگر بلا اس کے اختیار اور قصد کے پھر بھی غلط ہی نکلتے ہیں، سوچوں کہ کوئی دلیلِ شرعی یا عقلی اس شخص کی تکذیب پر اور اس حالت کے امتناع پر قائم نہیں، گو کثیر الوقوع نہیں لیکن اتنی قلیل بھی نہیں کہ عدیم النظیر کہا جاوے، غرض جب ایسا ممکن ہے تو اس شخص کی اس جز میں بھی تصدیق کی جائے گی۔

پس اس کی تصدیق کی بنا پر اس میں بھی چند احتمال ہیں: ایک یہ کہ یہ حالت بقیہ اثر ہو اس حالتِ خواب کا گو دونوں میں یہ تفاوت ہوگا کہ حالتِ خواب میں شعور و اختیار دونوں منفی ہوتے ہیں اور اس بیداری میں صرف اختیار منفی ہو شعور منفی نہ ہو، جیسا بعض اوقات آدمی کچھ ہذیان بکتا ہے اور بیدار ہو کر بھی تھوڑی دیر تک ایسا مغلوب رہتا ہے کہ وہی بکتا رہتا ہے اور مدار انتفاءِ تکلیف کا عدمِ اختیار پر ہے، اگرچہ بقائے شعور کے ساتھ ہو دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس پر

کسی کیفیتِ باطنیہ کا غلبہ ہو، سو واقعی اس کا مضمون پڑھ کر جو میرے قلب پر اثر ہوا اس اثر سے میرا وجدان انھی دو احتمالوں کی طرف علی سبیل التردد گیا اور دونوں احتمالوں پر ایسی حالت مثل خواب کے قابلِ تعبیر وتاویل ہوتی ہے، اس لیے میں نے اپنے جواب کو اس حالت کی بھی تعبیر مشترک قرار دیا۔ باقی مجھ کو اس پر بھی اصرار نہیں، کیوں کہ اس میں تیسرا چوتھا احتمال اور بھی ہے وہ یہ کہ اس حالت کا سبب کوئی آفت دماغ یا لسان میں ہو یا یہ کہ یہ شیطانی تصرف ہو کہ جس طرح وہ قلب میں وسوسہ ڈالتا ہے زبان پر ان کلمات کا القا کر دیا ہو، لیکن ہر حال میں بتقدیرِ نفیِ اختیار وقصد میں مصدق ہونے کے وہ نہ کافر ہے نہ عاصی ہے، بلکہ تیسرے احتمال پر تو یعنی جب کہ اس کا سبب کوئی آفت یا مرض ہو یہ حالت مذموم واثرِ شیطانی بھی نہیں۔

چناں چہ حضور ﷺ نے حق تعالیٰ کی فرح بالتوبہ کی مثال میں ایک شخص کی حکایت بیان فرمائی جس نے شدتِ فرح میں یہ کہہ دیا تھا: ''اللّٰهم أنت عبدي وأنا ربك'' حالاں کہ فی نفسہ یہ کلمۂ کفر ہے، مگر حضور ﷺ نے اس کو نقل فرما کر اس پر انکار نہیں فرمایا، بلکہ صرف اتنا فرمایا کہ ''أخطأ من شدة الفرح'' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آفت فی اللّسان کی حالت نہ مذموم ہے نہ اثر شیطانی ہے اور نہ حق تعالیٰ کی فرح محمود کی تشبیہ فرح مذموم شیطانی کے ساتھ لازم آتی ہے وهو باطل اور یہی حکم ہے آفت فی الدماغ کا بل بالأولى لأنه مرض، وقال الله تعالیٰ: ﴿وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ﴾، اور اس حدیثِ مثالِ تائب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کلمہ غیر صحیحہ پر ہر حالت میں گرانی ہونا ضروری نہیں۔ اور ایک اعرابی نے جو آپ کے سامنے کہہ دیا تھا کہ ہم حق تعالیٰ کو آپ کے سامنے شفیع لاتے ہیں تو آپ پر بے حد گرانی ہوئی تھی، کیوں کہ وہ تکلم بالقصد تھا گو جہل سے تھا اور یہاں بلاقصد فافهم، اور واقعہ زیرِ بحث میں تو بلاقصد سے بھی زیادہ یعنی مع قصد واہتمام تکلم بکلمہ صحیحہ ایک غلط کلمہ نکلا تو وہ بدرجۂ اولیٰ عدمِ گرانی کا مستحق ہوگا۔ اور چوتھے احتمال پر گو یہ سبب عن الشیطان ہو مگر معصیت پھر بھی نہیں، جیسا کہ قلب کے وسوسے کا حکم ہے اور جامع دونوں میں عدمِ قصد وعدمِ اعتقاد ہے، اور وسوسے کا یہ حکم یعنی عدمِ معصیت احادیث میں منصوص ہے، بلکہ باوجود وسوسے کے مذموم

ہونے کے اس کے بلاقصد آنے کو علاماتِ ایمان میں سے فرمایا گیا ہے۔

چناں چہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے "إنا نجد في أنفسنا ما يتعاظم إلخ" کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا أوجد تموه کے بعد ذاك صريح الإيمان ارشاد فرمانا (كما في المشكوٰة عن الصحيحين) صریح دلیل ہے اس کی، اور بعض احادیثِ وسوسہ میں جو استعاذہ کا امر فرمایا ہے یہ دلیل نہیں اس کے معصیت ہونے کی، ہاں! لفظِ استغفار سے اس دلالت کی گنجائش ہوسکتی تھی، چناں چہ معصیت نہ ہونا مجمع علیہ ہے اور یہ استعاذہ خواہ لفظاً ہو یا معناً۔ چناں چہ بعض احادیث میں وہ مذکور بھی نہیں صرف معنیٰ پر اکتفا فرمایا گیا، یعنی اس کو برا سمجھنا اور دفع کی کوشش کرنا جیسا واقعہ زیرِ بحث میں بھی ایسا کرنا مذکور ہے و نعم ما قال العارف الرومي:

ترک استثنا مرادم قسوتے ست
نے ہمی گفتن کہ عارض حالتے ست
اے بسا ناوردہ استثنا بگفت
جانِ او باجانِ استثنا ست جفت

بہرحال تیسرے اور چوتھے احتمال میں بھی معصیت لازم نہیں اور اگر تیسری حالت کے معصیت ہونے کا اس سے شبہ ہو جائے کہ حدیث میں ہے "من قال: باللات والعزى فليقل: لا إله إلا الله" جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ سبقِ لسان بھی اس درجہ کی معصیت ہے کہ تجدیدِ ایمان کی ضرورت ہے تو سمجھنا چاہیے یہاں ذکر اس شخص کا ہے جس کو پہلے سے عادت کفر بکنے کی تھی، پھر بھی اس امر بالتدارک کا سبب خود اس سبقِ لسان کا فی نفسہ معصیت ہونا نہیں بلکہ اس کے منشا یعنی عادت سابقہ اختیاریہ کا مذموم ہونا ہے اور تدارک جو اس کا لا إله إلا الله سے کیا گیا ہے سو مقصود اس کا اظہارِ بقاءِ ایمانِ سابق یعنی اظہارِ عدمِ زوالِ ایمانِ سابق ہے نہ کہ احداثِ ایمانِ جدید بعد زوال السابق، سو اس سے وجوبِ تجدید پر بھی استدلال نہیں ہوسکتا، خلاصہ یہ کہ اس صاحبِ واقعہ کی تصدیق کی بنا پر متعدد احتمالات مذکورہ میں سے جو احتمال بھی لیا جاوے ان سب میں اتنا تو امر مشترک ہے کہ یہ شخص نہ کافر ہوا نہ عاصی، پس اس

سے الزامِ ثانی وثالث بھی مرتفع ہوگیا۔ ثانی تو اس لیے کہ یہ شخص جب نہ کافر ہے نہ عاصی تو پھر زجر وتوبیخ کی کیا وجہ؟ اور گرانی کا جواب اوپر بضمن تقریر حدیثِ مثالِ تائب ہو چکا ہے ورنہ یہاں تو شب وروز مشاہد ہے کہ اس سے اہون امور پر گرانی وزجر تو کیا سخت سے سخت دار وگیر کی جاتی ہے تقریراً بھی تحریراً بھی۔

اور ثالث اس لیے کہ اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے اول تو یہی متیقن نہیں کہ یہ وسوسہ شیطانی تھا اور برتقدیر تسلیم بھی غایت مافی الباب میری ایک رائے کی غلطی ہوگی، مگر ملامت تو پھر بھی نہیں ہوسکتی۔ رہا چوتھا پانچواں الزام سو اوپر کی تقریر سے جب اس کا معذور عنداللہ ہونا ثابت ہو چکا تو واقعی جواب لکھنے کے وقت اس کی طرف درجۂ وسوسہ تک میں بھی التفات نہیں ہوا کہ آیا یہ ظاہر احکامِ فقہیہ میں بھی معذور ہوگا یا کہ غیر معذور ہوکر مامور بتجدید الایمان یا بتجدید النکاح ہوگا۔

اس لیے میں نے اس کے حکمِ فقہی سے جواب میں تعرض نہیں کیا تھا، بلکہ جواب لکھنے کے مدتوں بعد تک بھی مجھ کو یہ احتمال نہیں ہوا کہ کوئی صاحبِ علم اس کو غیر معذور سمجھیں گے، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ گو سب کی نہیں مگر بعض حضرات اکابر کی رائے اس کے ظاہراً وقضاءً غیر معذور ہونے کی طرف ہے۔ اس وقت میں نے اس کے حکمِ فقہی کے اظہار کی ضرورت سمجھی اور چوں کہ اس معاملے کا بوجہ مجیب ہونے کے میرے ساتھ ایک گونہ تعلق تھا اور میری رائے اس میں نرم تھی اس لیے میں نے اپنے فتوے پر اعتماد کرنے کو خلافِ احتیاط سمجھ کر دوسرے حضرات سے فتاوی حاصل کیے جن کا اس مقام پر تو (بوجہ کم گنجائش ہونے کے بدون اپنی رائے کو دخل دیے ہوئے) صرف خلاصہ بالفاظہا نقل کیے دیتا ہوں۔ بعد میں کسی موقعہ پر ان کو بعینہا مع ایک مفصل تحریر ایک صاحبِ علم[1] کے مرتب کرکے اگر کوئی صاحب شائع کرنے کے لیے مانگیں گے دے دیے جاویں گے، پس ان میں سے سہارن پور کے فتوے کا حاصل یہ ہے کہ

[1] ان صاحب علم کی تحریر بھی حضرت حکیم الامت نے حسب وعدہ شائع کردی ہے جو شوال ۱۳۳۶ھ کے ''الامداد'' میں ۶۳ صفحے ہیں۔

''صاحبِ واقعہ کا حادثہ ذوجہتین ہے، ایک جہت وہ ہے جس سے فیما بینہ و بین اللّٰہ تعالیٰ اس کو مومن قرار دیا جاتا ہے۔ دوسری جہت ظاہر اطلاق کلمۃ الکفر کی ہے کہ جس پر اس کو مامور بہ تجدید الایمان والنکاح احتیاطاً کیا جاتا ہے اس صورت میں فیما بینہ و بین اللّٰہ تعالیٰ نکاح اول بحالہ باقی ہے۔ لہٰذا اس کی زوجہ کو جائز نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے یا تجدیدِ نکاح سے انکار کرے''، انتھی.

اور دیو بند کے فتوے کا حاصل یہ ہے کہ ''اس کو معذور کہنے میں اور حکم کفر وارتداد نہ کرنے میں کچھ تردد نہیں ہے اور جب کہ حکمِ کفر وارتداد اس پر صحیح نہیں ہے تو حکمِ بینونتِ زوجہ بھی متفرع نہ ہوگا۔ استحباباً تجدید کر لینا مبحث سے خارج ہے، لیکن ضروری کہنا خلافِ ظاہر ہے''۔ اور اس دوسرے فتوے کی ایک تصدیق کا حاصل یہ ہے کہ ''عدمِ تکفیر اس قائل کی بحسبِ بیان اس کے کہ بلا اختیار اس سے یہ کلمہ صادر ہوا دیانۃً متفق علیہ ہے، البتہ زوجہ اس کی اگر تصدیق نہ کرے تو غایت یہ کہ زوجہ اس کو حلف دے۔''

اور دہلی کے فتوے کا حاصل یہ ہے کہ ''جب صاحب واقعہ نے اپنے اختیار اور ارادہ سے الفاظ مذکورہ نہیں کہے ہیں تو وہ بالاتفاق مرتد نہیں ہوا۔ اور چوں کہ ان الفاظ کا اس کی زبان سے صدور خطاً ہوا ہے اور اس صورت میں اتفاقاً کفر عائد نہیں ہوتا، اس لیے اس کو تجدیدِ نکاح یا تجدیدِ ایمان کا حکم بھی نہیں کیا جائے گا، احتیاطاً تجدید کر لینا بحث سے خارج ہے، اس کی منکوحہ قطعاً اس کے نکاح میں ہے اور اسے ہرگز دوسرا نکاح جائز نہیں۔

اگر اس کی یہ حالت بے خودی و بے اختیاری معروف ہو جب تو حکمِ قضا و دیانت میں کوئی فرق ہی نہیں۔ اور اگر یہ حالت معروف نہ ہوتا ہم بوجوہ مذکورہ بالا قضاءً بھی بلا قسم یا زیادہ سے زیادہ قسم کے ساتھ تصدیق کی جائے گی، انتھت اور اصل مدعی میں یہ سب فتوے متحد ہیں یعنی ۱۔ عدمِ حکم بالارتداد ۲۔ بقائے نکاحِ زوجہ ۳۔ عدمِ جوازِ نکاحِ زوجہ بالزوج الثانی۔ اور جو امور زائد علی اصل المدعی ہیں مثلاً: امر بتجدید نکاح والمان احتیاطاً، ان میں گو نہ اختلاف یہ معتد بہ اختلاف نہیں۔ پس ان فتووں کے باہم متخالف ہونے کا شبہہ نہ کیا جائے۔ اب میں

اس باب میں علما کی تحقیقات کو (جن میں بعض میرے اس شخص کو معذور سمجھنے کی بنا پر حکمِ فقہی سے تعرض کے ضروری نہ جاننے کی من کل الوجوہ مؤید ہیں) ظاہر کر کے سبکدوش ہوتا ہوں۔

اب علما اپنی تحقیق سے اور عوام اپنے معتقد فیہ علما کی تقلید سے اور اسی طرح صاحبِ واقعہ بھی ان فتووں کی تنقیح سے حکم فقہی معلوم فرمالیں۔ رہا پانچواں الزام سو واقعی میرے نزدیک یہ واقعہ اتنا ظاہر تھا کہ اس میں کسی ایسے شبہہ کی گنجائش میرے ذہن میں نہ تھی، اور کسی شبہہ کی گنجائش نہ ہونے ہی کے سبب میں نے جوابِ مجمل کو کافی سمجھا تفصیل کی حاجت نہ سمجھی، تو اس حالت میں اس کی اشاعت میں کسی مفسدہ کا احتمال کیوں کر ہوسکتا تھا، اور جب اس کا احتمال نہ تھا تو گو اشاعت میں نے نہیں کی، مگر اس کی اشاعت کو روکا بھی نہیں بالخصوص جب کہ اس کی اشاعت میں یہ فائدہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر کسی کو ایسی حالت پیش آوے تو وہ تلبیس سے محفوظ رہ کر اپنے جان وایمان کو بچا سکے اور ایسا ہی شخص اس فائدے کی قدر بھی کرسکتا ہے، ورنہ غیر صاحب حال کیا جانے بقول کسے:

اے ترا خارے بپاں شکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانے کہ شمشیرِ بلا بر سر خورند

یہ تھی حقیقت واقعہ کی راست راست بے کم وکاست۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ بحمد اللہ نہ صاحبِ واقعہ نے اور نہ احقر نے نہ کسی کفر کا ارتکاب کیا، نہ کسی معصیت کا، غایت مافی الباب بعض امور متعلّقہ رائے میں رائے کا اختلاف محتمل ہوسکتا ہے جو کسی درجے میں بھی محلِ ملامت نہیں ہے، مگر پھر بھی صمیمِ قلب سے کہتا ہوں: ''اللهم اغفر لي ما قدمت وما أخرت، وما أسررت وما أعلنت، وما علمت منه وما لم أعلم، وما أنت أعلم به مني، وأفوض أمري إلى الله إن الله بصير بالعباد''۔

۱۳۔ متعلّقہ صفحہ ۱۱: یہ مضمون ''الامداد'' شوال ۱۳۳۶ھ کا حوالہ ہے وہ ''الامداد'' مذکور کے صفحہ ۳ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۶ پر ختم ہوا۔ جس میں فتوی سہارن پور، حضرت سہارن پوری کی طرف سے اور فتوی دیو بند، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور فتوی دہلی، مفتی کفایت اللہ

صاحب کی طرف سے بہت تفصیلی ذکر کیے گئے ہیں، اور بہت طویل بحث اس سلسلہ میں کی گئی ہے اس سب کو تو یہاں نقل کرانا بہت دشوار ہے، جس کو دیکھنا ہو اصل ''الامداد'' میں دیکھے، اس میں ایک دوسرا خواب بھی ایک شخص کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی زیارت اور اس خواب کے متعلق حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے سوال اور حضرت قدس سرہٗ کا جواب مع تفصیل وتعبیر نقل کیا گیا ہے، مضمون تو بہت اہم ہے لیکن چوں کہ خاص اہلِ علم سے متعلق ہے اور طویل بھی بہت ہے کہ ساٹھ صفحے کا ہے اس لیے یہاں نقل نہیں کیا گیا۔

۱۴۔ متعلقہ صفحہ ۱۲: یہ وعظ مدرسہ مظاہر علوم کے سالانہ جلسہ جامع مسجد میں بروز یک شنبہ ۱۰ر جمادی الثانیہ ۱۳۳۶ھ میں ہوا جو ڈھائی گھنٹے تک مسلسل ہوا۔ یہ وعظ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی حال شیخ الاسلام پاکستان نے نقل کیا تھا۔ چار ہزار سے زائد مجمع تھا۔ وعظ تو ۴۴ صفحے کا ہے جس تمہید کا حضرت حکیم الامت نے ''خوانِ خلیل'' میں ذکر کیا ہے اس کو اس وعظ کے شروع میں مولانا ظفر احمد صاحب ناقلِ وعظ نے بھی ذکر کیا ہے۔

تنبیہ: جس سال یہ وعظ جلسۂ مظاہر علوم سہارن پور میں ہوا ہے اس سال حضرت اقدس سیدی حکیم الامت دامت برکاتہم پر ایک شخص کے خواب کی وجہ سے عوام کالأنعام نے زبانِ طعن بہت کچھ دراز کر رکھی تھی، اخبارات میں بھی اس کا بہت کچھ شور وغوغا رہا اور یہ سنت اللہ ہے کہ قائم بالامر کے ساتھ اول اول بہت مخالفتیں عوام کی طرف سے ہوا کرتی ہیں، مگر آخر میں سب کو گردنیں جھکانا پڑتی ہیں، بہرحال جب جلسۂ مذکورہ میں حضرت حکیم الامت تشریف لے گئے اور آپ کا بیان ہونا قرار پایا تو بیان سے پہلے سیدی ومرشدی حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب دامت برکاتہم نے مولانا سے فرمایا کہ اس وقت بہت بڑا مجمع موجود ہے، اس کے بعد کی عبارت حضرت سہارن پوری کے اس ارشاد تک کہ ''جب آپ کو گوارا نہیں تو پھر کوئی ضرورت نہیں'' کے بعد ''مظاہر الاقوال'' کی تمہید میں یہ ہے: اس کے بعد حضرت حکیم الامت منبر پر تشریف لے گئے اور بیان شروع فرمایا تو بے ساختہ زبان پر وہ آیت آئی جو حضرت صدیقہ کی برأت میں حق تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے کہ ان کے متعلق بھی ایک افترا وبہتان

منافقوں نے تراشا تھا، جس میں کچھ مسلمان بھی ملوث ہو گئے تھے، حق تعالیٰ نے ان مسلمانوں کو جنھوں نے اس بہتان میں حصّہ لیا تھا ان آیات میں سخت دھمکایا ہے۔

حضرت حکیم الامت نے اس آیت کو تلاوت فرما کر حفاظت لسان کی تاکید وضرورت بیان فرمائی۔ بعد بیان کے فرماتے تھے کہ میں نے تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ارشاد کو قبول نہ کیا تھا، مگر حق تعالیٰ نے مولانا کی خواہش پوری کر دی کہ مولانا جو کچھ چاہتے تھے وہی بیان ہو گیا۔ یہ مولانا کی توجہ کا اثر تھا کہ میری زبان سے یہی مضمون بیان ہوا جس کی مولانا کے خیال میں ضرورت تھی انتھی بمعناہ ظفر احمد۔ اس کے بعد وعظ شروع ہوا اور خطبہ مسنونہ کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ۝﴾[1]۔

۱۵۔ متعلّقہ صفحہ ۱۳: ذکرِ محمود جو النور جلد: ۱ حصّہ: ۲ بابت ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۳۹ھ میں یہ واقعہ اس طرح نقل کیا گیا ہے: ذکر: ۲۴ حضرت کے انصاف اور حق پرستی اور رعایتِ دین کا نمونہ ایک قصّہ سے واضح ہوتا ہے، ایک قصبہ میں ایک رئیس اور عالم کے یہاں جو اپنے ہی مجمع کے ہیں ایک تقریب تھی، احقر بھی اس میں مدعو تھا اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی اور دیگر حضرات بھی، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ رسومِ بدعت میں سے کوئی رسم وہاں نہیں اور کیوں کر ہوتی جب کہ صاحبِ تقریب خود بدعت سے مانع تھے، مگر عام برادری کی دعوت تھی جس کو میں بنا بر تجربہ رسوم تفاخر میں سے سمجھتا ہوں اور جن اکابر پر حسنِ ظن غالب ہے وہ اس میں توسع فرماتے ہیں، چناں چہ اس تفاوت کا یہ اثر ہوا کہ میں تو بلا شرکت واپس آ گیا اور دیگر حضرات نے شرکت فرمائی، خود اپنے ہی مجمع میں اس کا مختلف عنوانوں سے بڑا غوغا ہوا۔ اور مجھ سے تو جب اس اختلاف کے متعلق کسی نے سوال کیا میں نے تو بزرگوں کی ادب کی رعایت ہی مدنظر رکھ کر جواب دیا، مگر عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بھی جو بعض نے سوال کیا تو باوجود یہ کہ حضرت کے ذمہ اس

[1] نور: ۱۵

احقر کی رعایت کی کون ضرورت تھی، لیکن جو جواب عطا فرمایا اس میں جس درجہ رعایت ہے وہ قابلِ غور ہے۔

وہ جواب یہ تھا کہ واقعی بات یہ ہے کہ عوام کے مفاسد کی جس قدر فلاں شخص (یعنی احقر) کو اطلاع ہے ہم کو اطلاع نہیں اس لیے اس نے احتیاط کی۔ حقیقت یہ ہے کہ "بریں نکتہ گر جہاں فشانم رواست"۔ یہ جواب مجھ سے بعض ثقات نے نقل کیا۔

فقط از زکریا عفی عنہ۔

"النور" میں یہ واقعہ اتنا ہی چھپا ہے، چوں کہ یہ سیاہ کار بھی اس تقریب میں شریک تھا۔ اور اس سیہ کار کے سامنے ہی یہ شور وغوغا اور ہنگامہ برپا ہورہا تھا۔ ایسے موقعوں پر عوام میں توچہ میگوئیاں خوب ہوا کرتی ہیں۔ اس لیے بعض نے تو شیخین پر اعتراض کیا کہ حضرت تھانوی کے یہاں جتنی باریک بینی ہے بڑوں بڑوں کے یہاں بھی نہیں اور بعض نے حضرت تھانوی قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہ پر اعتراضات کیے کہ اکابر کے ہوتے ہوئے بھی اپنے تقوے کا مظاہرہ کیا۔ یہ غسل ختنہ عزیزم مولوی حکیم طیب مرحوم رام پوری کا تھا، جن کے صاحبزادے الحاج مولوی حافظ عامر انصاری سلمہ مقیم دہلی مصنّف رسالہ "فضائلِ علم ومناقبِ علما" وغیرہ ہیں۔ میں نے ان سے اس کی تاریخ پوچھتی تھی، انھوں نے لکھا کہ "والدِ مرحوم کے ختنہ کی تاریخ جیسا کہ انھوں نے خود لکھائی تھی اور ان کی بیاض میں بھی موجود ہے ۲۱ر ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ کو ختنہ ہوئی اور ۵ر جمادی الاولی ۲۹ھ کو تقریب صحتِ ختنہ ہوئی"۔ ان کے والد حضرت مولانا الحاج احمد صاحب رحمہ اللہ جن کے متعلق حضرت حکیم الامت نے "ذکرِ محمود" میں لکھا ہے کہ "کوئی رسم کیوں کر ہوتی جب کہ صاحبِ تقریب خود ایک عالم بدعت سے مانع تھے" حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کے حدیث پاک کے شاگرد تھے، اسی کے متعلق عزیزی مولوی عامر نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ "۱۴ر شوال ۱۳۰۳ھ کو دادا مرحوم بغرض تحصیلِ علمِ حدیث گنگوہ حضرت گنگوہی کی خدمت میں تشریف لے گئے اور تعلیمی سال کے بعد ۱۷ر شعبان ۱۳۰۴ھ بعد تکمیلِ صحاح ستہ فارغ ہوئے، فقط۔ حضرت الحاج حافظ محمد ضامن صاحب تھانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ کے اجل

خلیفہ جناب الحاج حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری کے بھتیجے تھے جس کی وجہ سے حضرت گنگوہی کے یہاں بھی خاص منظورِ نظر تھے اور اس کی وجہ سے حضرت گنگوہی کے اجل خلفا سب ہی سے خصوصی تعلق تھا، اخیر تک دار العلوم دیو بند کے ممبر اور مدرسہ مظاہر علوم کے سر پرست رہے، حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی مشہور تحریک ریشمی خطوط کے خاص راز داروں اور مشیروں میں سے تھے۔

شوال ۱۳۳۳ھ میں جب حضرت شیخ الہند وحضرت اقدس سہارن پوری نور اللہ مرقدہما حجاز تشریف لے گئے جس کی تفاصیل حضرت شیخ الہند وحضرت سہارن پوری کی سوانحوں میں مذکور ہے، روانگی سے قبل مظاہر علوم کے کتب خانہ میں تقریباً ایک ہفتہ تک حضرت شیخ الہند وحضرت سہارن پور، ی اعلیٰ حضرت رائے پوری شاہ عبدالرحیم صاحب اور یہی مولانا احمد صاحب مسلسل مشوروں میں شریک رہے۔ صبح کو اشراق کے بعد چائے سے فراغ پر یہ چاروں کتب خانہ میں تشریف لے جاتے اور اندر کی زنجیر لگالیتے اور بارہ بجے کے قریب جب حضرت سہارن پوری قدس سرہٗ کے کارکن حاجی مقبول احمد صاحب بار بار تقاضہ کرتے کہ کھانا ٹھنڈا ہو گیا تو دیر تک تو جواب ہی نہ ملتا اور پھر بہت دیر کے بعد مولانا احمد صاحب کہتے کہ آرہے ہیں آرہے ہیں اور ظہر کی اذان کے قریب یہ حضرات اترتے اور جلدی جلدی ٹھنڈا گرم کھانا نوش فرماتے اور پھر ظہر کی نماز کے بعد اوپر تشریف لے جاتے اور عصر کی اذان کے قریب اترتے۔

جیسا کہ میں ''آپ بیتی'' ۴ کے صفحہ: ۲۸ پر اس واقعہ کو ذکر کر چکا ہوں، مولانا حکیم احمد صاحب ہمارے اکابر کے یہاں بڑے مدبر ذی رائے سمجھے جاتے تھے، اہم مشوروں میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی، اس لیے دونوں مدرسوں کے ہمیشہ اہلِ شوریٰ میں داخل رہے۔ بڑے متقی تھے اور میرے چوں کہ ننھیال کی طرف سے رشتہ دار بھی تھے، اس لیے مجھ پر شفقت بھی بہت فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے میری ابتدائی مدرسی کے زمانے میں فرمانے لگے کہ مولوی زکریا! تمہارے ان مدرسوں سے کچھ آتا جاتا ہو اس کو تو تم جانو، ہم تو ایک بات جانیں کہ باپ داداؤں سے یہ سنتے آئے تھے کہ فلاں چیز نہیں کھانی، یہ نہیں کھانا، وہ نہیں کھانا،

تمہارے مدرسوں میں پڑھ کر یہ چیز جاتی رہتی ہے۔ جو چاہے کھلا دو، زکاۃ کا کھلا دو، صدقے کا کھلا دو، تیجے کا کھلا دو، مجھ پر بہت ہی شفقت فرمایا کرتے تھے، مجھے اپنے رام پور کے مدرسے کے لیے حضرت قدس سرہٗ سے کئی بار مانگا، مگر حضرت نے ہر مرتبہ یہ کہہ کر انکار فرما دیا کہ یہ تو مظاہر میں رہے گا۔ عزیز عامر نے لکھا ہے کہ دادا صاحب کی پیدائش ۲۰/ ذی قعدہ، ۱۲۸۲ھ قبیل صبح صادق ہوئی۔ محمد ظریف تاریخی نام ہے اور یہی بندہ کی ''تاریخِ کبیر'' میں بھی ہے اس میں سنِ وفات اوائل ۴۲ھ تحریر ہے، رام پور کے اپنے جدی قبرستان میں جناب الحاج حافظ محمد یوسف صاحب بن جناب حضرت الحاج حافظ محمد ضامن صاحب شہید کے برابر میں دفن ہوئے۔ نور الله مرقده و أعلى الله مراتبه.

۱۶۔ متعلقہ صفحہ ۱۳: بھاول پور کے سفر کے متعلق ایک واقعہ اس ناکارہ کے بھی علم میں ہے۔ اور اس جام کو پڑھ کر بندے کے ذہن میں آیا کہ غالباً وہ واقعہ بھی اسی سفر کا ہیں جس کو میں لکھوا رہا ہوں، اور یاد پڑتا ہے کہ ''آپ بیتی'' میں اس واقعہ کو کہیں لکھوا بھی چکا ہوں کہ حضرت مولانا الحاج سر رحیم بخش صاحب سرپرست مدرسہ مظاہر علوم متوطن ٹھسکہ میرانجی ریاست بھاول پور کے وزیر تھے۔ اور نواب صاحب بھاول پور کے انتقال کے بعد چوں کہ نواب زادہ ولی عہد کم سن تھے اس لیے یہ ان کے اتالیق کے طور پر ان کے بلوغ تک نواب صاحب کے قائم مقام رہے اور سارے اختیارات ریاست کے ان ہی کے قبضے میں تھے اور چوں کہ حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ سے بیعت تھے، اس لیے حضرت کے اجل خلفائے اربعہ اور حضرت حکیم الامت سے بہت خصوصی تعلّق تھا اور ان کے اس خصوصی تعلّق کی بنا پر ان حضراتِ اکابر کا ان کی درخواست پر بھاول پور کثرت سے تشریف لے جانا ہوا کرتا تھا، بہت ہی خوبیوں کے آدمی تھے۔

یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق علی میاں نے عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح کے باب اول صفحہ: ۹۲ میں اس سیہ کار کا ذکر کرتے ہوئے اس ناکارہ کے متعلق دو ابتلا لکھے، جس میں سے دوسرا کرنال میں مدرسی کے لیے اس ناکارہ پر وہاں کی مدرسی کے لیے

زور دیا، مرحوم کی کوئی سوانح بھی ان کے انتقال کے بعد لکھی گئی تھی جو اس وقت یاد نہیں۔ باوجود نواب صاحب کی قائم مقامی کے ایسی سادہ زندگی گزارتے تھے کہ جب انگریزی درباروں میں وائسرائے وغیرہ یا وزیر ہند کی آمد پر کوئی دربار ہوتا تو وہ اس میں ضرور مدعو ہوا کرتے تھے، اوران کی کرسی نوابوں کی کرسی کے پاس ہی ہوتی تھی، چوں کہ سادہ لباس ہوا کرتا تھا اور بہت ہی سادہ اوران کے ملازم نہایت ہی خوش پوشاک، کوٹ بھی زریں قیمتی جس پر سنہرے بٹن بھی کثرت سے لگے ہوئے ہوتے تھے، پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ سارے درباری یہ سمجھتے کہ یہ ملازم تو وزیر صاحب ہیں اور ان کا چوبدار آگے آگے جا رہا ہے، لیکن جب دربار میں پہنچنے کے بعد یہ اپنی کرسی پر بیٹھتے اور ملازم چونری لے کر کرسی کے پیچھے کھڑا ہوتا جب لوگوں کو معلوم ہوتا کہ یہ وزیر صاحب ہیں اور یہ ان کے چوبدار۔ بڑی خوبیاں تھیں، اپنی اس نوابی کے زمانے میں ریاست کے سارے کاروبار سے نمٹنے کے بعد اپنے والد کے جو ایک کسان تھے اور سارا لباس ان کا گجروں جیسا ہوتا تھا ان کے پاؤں سارے عملہ اور سارے خدام کے سامنے دبایا کرتے تھے، اور جب ان اطراف میں آتے تو ان اکابر کے سامنے ایسا دو زانوں بیٹھتے جیسا کوئی بہت ادنی خادم ہو، ان کے محاسن کے واسطے تو بڑا دفتر چاہیے۔

ایک مرتبہ ان کی طلب پر حضرت اقدس سہارن پوری، حضرت شیخ الہند اور حضرت حکیم الامت تینوں ساتھ ہی بھاول پور تشریف لے گئے اور ساتھ ہی واپس تشریف لائے، واپسی پر انھوں نے ہر سہ حضرات کی خدمت میں علی التساوی ایک گراں قدر ہدیہ پیش کیا، شیخین نے تو قبول کرلیا اور حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ مجھے چوں کہ اشراف نفس ہوگیا تھا اس لیے قبول سے معذوری ہے اور ان دونوں حضرات کو نہیں ہوا ہوگا۔ مولانا رحیم بخش صاحب نے وہ رقم فوراً لے کر اپنی جیب میں رکھ لی اور اشارتاً بھی کوئی لفظ اس کے قبول کرنے کے متعلق نہیں کہا، یہ سب حضرات ان سے رخصت ہوکر ریل میں سوار ہوگئے۔ مولانا رحیم بخش صاحب نے اپنے ایک ملازم کے ذریعے حضرت حکیم الامت کی رقم ایک لفافہ میں بند کر کے بھیجی اور اس میں ایک پرچہ لکھا کہ حضرت والا نے اشراف نفس کے احتمال سے یہ

ناچیز ہدیہ واپس فرما دیا تھا، اور اس خاک سار کو حضرت اقدس کی منشا کے خلاف مکرر درخواست کی جرأت نہیں ہوئی، لیکن اب تو حضرت واپس جا چکے اور اشراف کا کوئی احتمال بھی نہیں رہا اس لیے امید ہے کہ اس ناچیز ہدیہ کو قبول فرمالیں گے اور اگر اب بھی کوئی گرانی ہو تو حضرت کی طبع مبارک کے خلاف ذرا اصرار نہیں۔ اس مضمون کا پرچہ لفافہ میں بند کر کے اس نوکر سے کہا کہ جب ۷، ۸ اسٹیشن گزر جائیں تو فلاں جنکشن پر یہ بند لفافہ حضرت کی خدمت میں پیش کر دینا اور پوچھ لینا، حضرت اگر کچھ جواب دیں تو لیتے آنا، ورنہ چلے آنا۔ چناں چہ حسبِ ہدایت ملازم نے چند اسٹیشن جا کر وہ لفافہ پیش کیا اور حضرت نے پڑھا اور بہت ہی اظہارِ مسرت کیا اور فرمایا کہ محبت خود طریقے سکھلا دیتی ہے۔

مجھے تو اس قصہ پر ہمیشہ ایک مصرع یاد آتا ہے کہ ''محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی'' بہرحال حضرت نے قبول فرما کر تحریر فرمایا کہ خدا تعالیٰ آپ کے فہم و ذکا میں ترقی عطا فرمائے، واقعی اب مجھے کوئی عذر نہیں۔ مولانا سر رحیم بخش صاحب کا اصل وطن ٹھسکہ میرانجی ضلع کرنال تھا۔ نواب صاحب کے بلوغ پر جب وہ خود بااختیار ہو گئے تو یہ بھاول پور سے پنشنر ہو کر اپنے وطن ٹھسکہ تشریف لے آئے تھے۔ اور صرف ۱۹ گھنٹے بیمار رہ کر بوقت ۴ بجے صبح شنبہ ۳۰ رمحرم ۵۴ھ مطابق ۴ رمئی ۳۵ء بعمر ۷۶ سال عیسوی رحلت فرما گئے، إنا لله وإنا إليه راجعون أللهم اغفر له. ۴ھ میں ذی الحجہ کے پورے مہینے گنگوہ قطب عالم کی خدمت میں رہے اور بیعت سے مشرف ہوئے اور واپسی پر حافظ علیم الدین گنگوہی کو جو اس وقت بچے تھے اپنے ساتھ ملازم بنا کر لے گئے۔ حافظ صاحب مرحوم بھی مولانا کے نہایت ہی وفا دار خادم، حضر وسفر کے حاضر باش، نہایت سادہ مزاج، مولانا مرحوم کے انتقال کے کئی سال بعد تک ٹھسکہ ہی میں رہے اور گھر کا سارا مہمانوں وغیرہ کا انتظام حافظ صاحب مرحوم ہی کے ذمہ تھا، مولانا مرحوم کے انتقال سے چند سال پہلے انھوں نے اپنے ضعف کی وجہ سے اپنے بھتیجے کو بھی ملازم کر دیا تھا جو نہایت جوان فوجی آدمی معلوم ہوتا تھا، اوپر جس خوش پوشاک ملازم کا ذکر کیا گیا وہ یہی دوسرے ملازم تھے۔ (تاریخِ کبیر)

١٧۔ متعلقہ صفحہ ٢٢: اس نوع کا ایک ارشاد حکیم الامت کا حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نور اللہ مرقدہ کے متعلق بھی ہے، جس کی تفصیل آپ بیتی ٤ میں حضرت حکیم الامت کے احوال میں گزر چکی ہے جو حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نور اللہ مرقدہ کی گرفتاری محرم ۵١ھ کے سلسلے میں ارشاد فرمایا۔ علما حقہ میں رائے کا اختلاف مذموم چیز نہیں بلکہ محمود ہے بڑی رحمت ہے، بشرطے کہ خلافِ نزاع مجادلہ کا ذریعہ نہ بنے۔ اس ناکارہ نے تو جب سے ''مشکوۃ شریف'' شروع کی تھی اسی وقت سے علما کے اختلاف کو بالخصوص صحابہ کرام، ائمۂ مجتہدین کے اختلاف کو بڑی رحمت سمجھتا رہا ہے۔ یہ میرا طبعی ذوق ہے، لیکن جب کتبِ حدیث میں حضرت عمر بن عبدالعزیز عمرِ ثانی رحمۃ اللہ کا یہ مقولہ نظر سے گزرا کہ مجھے اس بات سے مسرت نہ ہوتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا، اس لیے کہ ان میں اگر اختلاف نہ ہوتا تو گنجائش نہ رہتی، حدیث پاک کے پڑھانے کے درمیان میں ہمیشہ میں نے اس پر زور دیا کہ اہلِ حق کا اختلاف مبارک ہے مذموم نہیں۔ اب سے ٣٤ سال پہلے جب کہ حضرت حکیم الامت اور حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہما کے درمیان میں لیگ کانگریس کا اختلاف تھا۔

اس وقت شعبان ۵٧ھ میں اس ناکارہ کا ایک رسالہ الاعتدال في مراتب الرجال شائع ہوا تھا، جس کو میرے دونوں اکابر اور ان کے مخصوص خدام نے بہت ہی پسند کیا تھا۔ بالخصوص حضرت اقدس مولانا الحاج الشاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہ اور میرے چچا جان حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہ کے شدید اصرار پر وہ رسالہ نہایت عجلت میں طبع کرایا گیا تھا اور اس کے بعد سے ہندو پاک میں کئی مرتبہ طبع ہو کر فروخت اور تقسیم ہو چکا ہے۔ اس کے سوال: ٧ کے جواب میں یہی مضمون بہت تفصیل سے لکھا گیا تھا۔ اور میرے حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہ کے سفری بیگ میں تو یہ رسالہ مستقل رہتا تھا اور اسفار میں کبھی کبھی ملاحظہ بھی فرماتے رہتے تھے۔ میرے اکابر میں مسائل میں نہیں بلکہ طبائع میں بھی ہمیشہ اختلاف رہا اور اس اختلاف پر ثمرات بھی بہت مختلف مرتب ہوتے رہے۔

حضرت اقدس شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے یہاں رحم دلی، دل داری کا بہت غلبہ تھا۔ حضرت تھانوی نے ایک ملفوظ میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت حاجی صاحب تھانہ بھون میں اپنے مشاغل سے فارغ ہوکر دوپہر کے وقت قیلولہ کے لیے ایک مرتبہ لیٹے تو ایک صاحب تخلیہ کا وقت دیکھ کر آبیٹھے اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ پر نیند کا غلبہ، آنکھیں بند ہوتی تھیں۔ لیکن ان کی دل داری میں کچھ نہ فرمایا، دوسرے دن پھر ایسا ہی ہوا کہ حضرت بیٹھے ان سے باتیں کرتے رہے۔ یہ صاحب یہ سمجھ کر آئے تھے کہ تخلیہ کا وقت ہے تنہائی میں خوب توجہ ہوگی تو حضرت حافظ محمد ضامن صاحب نے اپنی جگہ سے للکار کر ان صاحب سے کہا کہ خود تو رات بھر بیوی کو بغل میں لیے پڑے سوتے رہتے ہو اور یہ بے چارے رات بھر اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں، دوپہر کو تھوڑا سا وقت لیٹنے کو ملتا ہے تو تم لغویات میں وقت ضائع کردیتے ہو، اگر اب سے اس وقت آئے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ حافظ صاحب بہت تیز مزاج تھے، کبھی حضرت حاجی صاحب کو بھی اور کبھی مولانا شیخ محمد صاحب کو بھی سنا دیتے تھے:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اسی طرح حضرت اقدس گنگوہی قدس سرہٗ اور حضرت اقدس نانوتوی قدس سرہٗ کے مزاج میں بھی طبعی اختلاف تھا کہ حضرت نانوتوی کے یہاں دل داری کا مضمون بہت بڑھا ہوا تھا۔ حضرت تھانوی نے اپنے ایک ملفوظ ''حسن العزیز'' جلد اول: ۴۹۵ میں یہ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہوتا تو اشراق اور چاشت بھی قضا کردیتے تھے۔ مولانا رشید احمد صاحب کی اور شان تھی، کوئی بیٹھا ہو جب وقت اشراق یا چاشت کا آیا وضو کرکے وہیں نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوگئے، یہ بھی نہیں کہ کچھ کہہ کر اٹھیں کہ میں نماز پڑھ لوں یا اٹھنے کی اجازت لیں۔ جہاں کھانے کا وقت آیا لکڑی لی اور چل دیئے۔ چاہے کوئی نواب ہی کا بچہ بیٹھا ہو۔ وہاں یہ شان تھی جیسے بادشاہوں کی شان۔

مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب جب حج کو چلے تو بمبئی میں مولانا محمد

قاسم صاحب تو لوگوں میں ملتے پھرتے اور مولانا گنگوہی انتظام میں مشغول رہتے۔ جب مولانا محمد قاسم صاحب واپس آتے تو مولانا گنگوہی فرماتے کہ کچھ فکر بھی ہے کہ کیا انتظام کرنا ہے؟ آپ ملتے جلتے ہی پھرتے ہیں۔ مولانا فرماتے کہ مجھے فکر کی کیا ضرورت ہے جب آپ بڑے سر پر موجود ہیں۔ پھر فرمایا کہ ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب مولانا گنگوہی سے فرمانے لگے کہ ایک بات پر بڑا رشک آتا ہے آپ کی نظر فقہ پر بہت اچھی ہے، ہماری نظر ایسی نہیں، بولے کہ جی ہاں! ہمیں کچھ جزئیات یاد ہوگئیں تو آپ کو رشک ہونے لگا۔ آپ مجتہد بنے بیٹھے ہیں ہم نے کبھی آپ پر رشک نہیں کیا۔ ایسی ایسی باتیں ہوا کرتی تھیں، وہ انھیں اپنے سے بڑا سمجھتے تھے اور وہ انھیں۔

اس ملفوظ میں حضرت تھانوی نے حضرت گنگوہی کے اور بھی کئی واقعات بیان فرمائے ہیں اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ایک مرتبہ نانوتہ میں مولانا مظفر حسین صاحب تشریف لائے، وہاں حضرت مولانا رشید احمد صاحب ومولانا محمد یعقوب صاحب ومولانا محمد قاسم صاحب موجود تھے، فرمایا: بھائی! ایک مسئلہ میں تردد ہے، میں نے سنا تھا کہ سب صاحب زادے جمع ہیں اس لیے مسئلہ پوچھنے آیا ہوں، وہ مسئلہ یہ کہ چلتی ریل میں نماز پڑھنے میں علما اختلاف کرتے ہیں کہ جائز ہے یا نہیں؟ بس تم لوگ آپس میں گفتگو کرکے ایک منقح بات بتلا دو کہ جائز ہے یا نہیں؟ میں دلائل نہیں سنوں گا۔ چناں چہ سب حضرات نے آپس میں گفتگو کی، مولانا نے ادھر التفات بھی نہیں فرمایا۔ گفتگو کرکے ان حضرات نے عرض کیا کہ حضرت طے ہوگیا، جائز ہے۔ فرمایا کہ اچھا، تو پھر میں جاتا ہوں، عجیب شان کے لوگ تھے۔

ملفوظ: ۲۸۱ حسن العزیز جلد اول میں لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا نانوتوی نور اللہ مرقدہ کھلم کھلا کسی کو برا نہیں کہتے تھے اور حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ صاف صاف کہتے تھے، لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے، چاہے کوئی رہے چاہے کوئی جائے۔ پہلے میں بھی نرم جواب کو پسند کرتا تھا، لیکن اب تجربے کے بعد مولانا گنگوہی کا طرز نافع ثابت ہوا۔

اور دوسرے ملفوظ میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ کا ارشاد ہے کہ تحمّل

سے زیادہ کبھی اپنے ذمہ کام نہ لے۔ چناں چہ ایک صاحب نے مولانا کے کسی مہمان سے بسترہ کو پوچھ لیا تو معلوم ہونے کے بعد فرمایا کہ اگر اس کے پاس نہ ہوتا تو تم کہاں سے دیتے؟ اور اگر ایک دو بستر کہیں سے لاکر دے بھی دیتے تو اگر بہت سے مہمان آتے اور کسی کے پاس بھی بسترہ نہ ہو تو سب کے لیے کہاں سے لاؤ گے؟ خبردار! جو کسی سے بسترہ کے لیے پوچھا، جو آوے اپنے ساتھ بسترہ لے کر آوے۔ اسی طرح سنا گیا کہ ایک مرتبہ جاڑے کے زمانے میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنی رضائی تو کسی مہمان کو دے دی، پھر مولانا گنگوہی سے ان کی اپنے لیے رضائی مانگی تو فرمایا کہ اپنی رضائی کیوں دوسرے کو دے دی؟ میں تو اپنی رضائی نہیں دیتا، جب انھوں نے کہا کہ حضرت میں رات بھر جاڑے میں مروں گا تب دو شرطوں سے دی، ایک: یہ کہ تہجد کے وقت مجھے واپس کر دینا، کیوں کہ لحاف اوڑھ کر مجھ سے نہ اٹھا جاوے گا، اور دوسرے: کسی اور شخص کو مت دینا، تاکہ کسی کی جوں نہ چڑھ جاوے، فقط۔ اس اختلافِ طبائع کا اثر حضرات کے خدام میں بھی نمایاں تھا۔ حضرت شیخ الہند اور شیخ الاسلام میں قاسمی رنگ کا غلبہ تھا، اور حضرت سہارن پوری اور حضرت تھانوی میں حضرت گنگوہی کے رنگ کا غلبہ تھا، اور حضرت شاہ عبدالرحیم قدس سرہٗ کا تو عجیب معاملہ تھا کہ رنگِ طبیعت تو قاسمی رنگ کا تھا، لیکن ہیبت کا اثر خدام پر اتنا ہوتا تھا کہ عملاً گنگوہی طرز کا ظہور رہتا تھا۔

اور یہ اختلافِ طبائع حادث نہیں بلکہ قدیم ہے۔ میں نے اپنے رسالہ ''اعتدال'' میں ایک حدیث نقل کی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے: آسمان میں دو فرشتے ہیں، ایک سختی کا حکم کرتے ہیں، دوسرے نرمی کا اور دونوں صواب پر ہیں، ایک جبریل علیہ السلام، دوسرے میکائیل علیہ السلام۔ اور دو نبی ہیں، ایک نرمی کا حکم کرتے ہیں، دوسرے سختی کا اور دونوں صواب پر ہیں: ایک ابراہیم علیہ السلام، دوسرے نوح علیہ السلام۔ اور میرے دو ساتھی ہیں، ایک نرمی کا حکم کرتے اور دوسرے سختی کا، ایک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، دوسرے حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔ یہ مضمون ''اعتدال'' میں بہت تفصیل سے آچکا ہے۔ اس لیے اکابر کے اختلافِ رائے اور اختلافِ طبائع کو ہم جیسوں کے آپس کے اختلاف پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کا یہ ارشاد کہ

باوجود اختلاف کے انجذاب ہوتا تھا کوئی نئی چیز نہیں، حضرات شیخین کی آپس کی محبّت کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟

میرے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اس سیہ کار سے ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ میرا تمہارا ہر چیز میں تو اختلاف، مجھے میٹھے کا شوق تمہیں نفرت، میں مرچ کے پاس نہیں جاتا تم سے بغیر مرچ کھایا نہیں جاتا۔ تم گوشت بغیر نہیں کھاسکتے اور میں گھاس کھانے والا وغیرہ وغیرہ کے بعد فرمایا کرتے: پھر معلوم نہیں تمہاری طرف اتنی کشش کیوں ہے؟ پھر بعض دفعہ فرمادیا کرتے کہ اس اختلافِ طبائع کے باوجود معلوم نہیں تم سے عشق کیوں ہوگیا؟ بہرحال علما اور اکابر کا اختلاف رائے اور اختلافِ مسائل بہت ہی مبارک ہے، مگر ہم جیسے نااہل، نالائق اس کو ایک فتنہ بنادیتے ہیں۔

۱۸۔ متعلقہ صفحہ ۲۳: ''اصلاح انقلاب'' جلد دوم میں مستقل رسالہ ''الخطوب المذیبة للقلوب المنیبة'' میں اس کی تفصیل موجود ہے، وہاں حضرت کے نام کو ایک بزرگ صاحبِ ارشاد وتلقین کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔

ترجمۃ المصنف

از حضرت شیخ الحدیث مولانا الحاج محمد زکریا رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم.

اس ناکارہ کے اکابر شموس وبدورِ ہدایت، ہر ایک اپنے علوم ومعرفت اور علوِ شان، فقہ وسلوک، تفسیر وحدیث میں ممتاز:

أولئك آبائي فجئني بمثلهم
إذا جمعتَنا يا جرير المجامع
الٰہی! کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں
کہ ہر اک دست بوسی کیا قدم بوسی کے قابل ہے
یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر
ان ہی کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی
انھیں کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے
انھیں کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلّق ہوں
پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزہ آئے
اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

لیکن اس کے باوجود گلدستے کے پھولوں کی طرح سے ہر ایک کی بو الگ، نظافت، ولطافت الگ، اور گلدستہ جب ہی کامل ومکمّل ہوسکتا ہے جب کہ اس میں مختلف رنگوں کے اور

مختلف خوشبوؤں اور اداؤں کے پھول ہوں:

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن

اے ذوق! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

میرے جملہ اکابر کی سوانح عمریاں مختصر و مفصل بہت سی لکھی گئیں ہیں، جن میں ان کے علمی کمالات، عملی ریاضات، معارف وعلوم وحکمت پر مختصر مفصل سب ہی کچھ لکھا گیا، لیکن ان سب کا احاطہ نہ ہوسکتا ہے اور نہ مجھ جیسے ناقص العلم والفہم کے ادراک میں آسکتے ہیں، مگر میرا جی یہ چاہا کرتا ہے کہ ان اکابر کے تاریخی حالات نہایت اجمالی طور پر ضرور دوستوں کو مستحضر رہیں، اس سے دَور اور زمانے کا علم تو ہوتا رہے۔ اسی لیے میں نے اپنے اکابر کا حال جس تذکرہ میں عربی میں یا اردو میں لکھا بہت مختصر لکھا۔ چوں کہ ''خوانِ خلیل'' حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ کی تالیف ہے اور حضرت حکیم الامت کی سوانح عمریاں مختصر ومطول ہند و پاک میں بہت سی لکھی جاچکی ہیں اور گو کمالاتِ علمیہ اور عملیہ تو ان میں بھی نہ آئے، ان میں ''اشرف السوانح'' (مؤلفہ محبي ومخلصي جناب الحاج خواجہ عزیز الحسن) بہت ہی مکمل اور قابلِ اعتماد ہے کہ خود حضرت حکیم الامت کے زمانۂ حیات میں لکھی گئی اور خود حضرت کی نظرِ ثانی دو حصوں پر ہوئی، اس کے بعد جتنی لکھی گئیں وہ سب اسی سے ماخوذ اور ان کا چربہ ہیں جو مختلف اہلِ ذوق نے اپنے ذوق کے موافق لکھی ہیں، میرا ذوق، جیسا کہ میں نے اوپر لکھا، نہایت مختصر تاریخی حالات لکھ دینے کا ہے، اسی لحاظ سے اس مختصر مضمون میں ''خوانِ خلیل'' کے مصنّف حضرت اقدس حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے مختصر تاریخی حالت لکھنے کا ہے۔

یہ تو مشہور ہے کہ آپ کی پیدائش ایک صاحبِ خدمت مجذوب حافظ غلام مرتضیٰ پانی پتی کی دعا سے ہوئی، اس لیے کہ آپ کے والد صاحب نے مرضِ خارش سے تنگ آکر اطبا کے مشورے سے کوئی دوا قاطع النسل کھالی تھی جس کی وجہ سے اولاد کے پیدا ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ آپ کی نانی صاحبہ بہت پریشان تھیں، انھوں نے اپنی لڑکی (یعنی آپ کی والدہ ماجدہ) کے لیے دعا کرائی۔ ان مجذوب نے پیشین گوئی کی کہ اس لڑکی سے دو لڑکے پیدا ہوں گے،

ایک میرا ہوگا جو مولوی، عالم، حافظ ہوگا، اس کا نام اشرف علی رکھنا اور دوسرا دنیا دار ہوگا، اس کا نام اکبر علی رکھنا۔ حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے تھے کہ میں جو کسی وقت اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں تو انھیں مجذوب صاحب کی روحانی توجہ کا اثر ہے، جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں، کیوں کہ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے۔

تاریخ ولادت: ۵ر ربیع الآخر ۱۲۸۰ھ کو بدھ کے دن صبح صادق کے وقت آپ کی ولادت ہوئی۔ تاریخی نام کرم عظیم ہے۔ ددھیالی نام عبدالغنی تجویز ہوا اور ننھیالی اشرف علی، پھر اسی کو غلبہ ہوا۔

حضرت کا تعلیمی دور قرآن شریف سے ہوا، چند پارے آپ نے کھتولی ضلع مظفّرنگر کے رہنے والے اخون جی سے پڑھے، پھر حافظ حسین علی صاحب سے جو دہلی کے رہنے والے تھے اور میرٹھ میں قیام تھا آپ نے دس سال کی عمر میں حفظ سے فراغت پالی تھی۔ فارسی کی تعلیم میرٹھ کے استاذوں سے حاصل کی اور پھر متوسطات تھانہ بھون میں حضرت مولانا فتح محمد صاحب سے پڑھیں، اور انتہائی کتب فارسی ابوالفضل تک اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں جو ادبِ فارسی کے استاذِ کامل تھے۔ اس کے بعد دیوبند تشریف لے گئے۔ عربی کی ابتدائی چند کتابیں مولانا فتح محمد صاحب تھانوی سے پڑھیں اور فارسی کی چند کتابیں ''سکندر نامہ'' وغیرہ بھی دیوبند میں مولوی منفعت علی صاحب سے پڑھیں، دیوبند کا داخلہ آخر ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ میں ہے، وہاں جا کر حضرت نے نورالانوار، ملاحسن، مشکوٰۃ شریف، مختصر المعانی شروع کی اور پانچ سال تک مسلسل دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن دورانِ تعلیم میں حضرت کو خارش کا مرض لاحق ہوا۔ جب کہ حضرت کی عمر اٹھارہ برس کی تھی، چھٹی لے کر اپنے مکان تھانہ بھون تشریف لے گئے اور چوں کہ طلبِ علم کا زمانہ شروع ہو چکا تھا خالی رہنا مشکل تھا۔ اس لیے بطور مشغلہ کے مثنوی ''زیر و بم'' تصنیف فرمائی جس کا پہلا شعر جو اس کی تمہید ہے یہ ہے:

همی گوید گرفتار درد و ناله
نادان هشتده ساله

۱۳۰۱ھ جب کہ حضرت کی عمر بیس سال کی تھی علومِ ظاہریہ سے فراغت حاصل کی۔
حضرت حکیم الامت کی طالبِ علمی کے زمانے میں ان کی تائی صاحبہ نے فرمایا کہ بھائی! تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے وہ تو خیر کما کھائے گا اور بڑا عربی پڑھ رہا ہے اس کی گزر اوقات کی کیا صورت ہوگی؟ کیوں کہ جائیداد وارثوں میں تقسیم ہوکر قابل گزارہ کے نہ رہے گی، یہ بات والد صاحب کو بہت ناگوار ہوئی اور باوجود اس کے کہ تائی صاحبہ کا بہت ادب کرتے تھے یہ سن کر جوش آگیا اور کہنے لگے کہ بھابی صاحبہ! یہ تم نے کیا کہا؟ خدا کی قسم! جس کو تم کمانے والا سمجھتی ہو ایسے ایسے اس کی جوتیوں سے لگے لگے پھریں گے اور یہ ان کی جانب رخ بھی نہ کرے گا۔ یہ مقولہ نقل کرکے حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے تھے کہ اگر یہ بات کوئی درویش کہتا تو اس کی بڑی کرامت سمجھی جاتی، لیکن والد صاحب تو دنیادار سمجھے جاتے تھے۔

دیوبندی دور کے اساتذہ کرام: ۱۔ حضرت اقدس نانوتوی قدس اللہ سرہٗ، حضرت حکیم الامت نے ان سے کوئی سبق تو نہیں پڑھا، لیکن درسِ ''جلالین'' میں شرکت کیا کرتے تھے۔

۲۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرسِ اول جو حضرت حاجی صاحب کے اکابرِ خلفا میں شمار ہوتے تھے اور اسباق میں بھی علومِ ظاہریہ کے ساتھ علومِ باطنیہ سے بھی طلبا کو مستفید فرماتے تھے۔

۳۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدرس چہارم جب کہ حضرت حکیم الامت ۱۲۹۵ھ میں دیوبند میں داخل ہوئے تو حضرت شیخ الہند کے پاس ''مختصر المعانی'' اور ''ملا حسن'' کے اسباق پڑھے۔ حضرت حکیم الامت نے اپنی تعلیم کی تفصیل ''سبع سیارہ'' میں لکھی ہے۔

ان دو کے علاوہ حضرت کے اساتذہ میں مولانا سید احمد صاحب مدرسِ دوم اور ملا محمود صاحب مدرسِ سوم اور مولانا عبدالعلی صاحب بھی تھے۔ ''ذکرِ محمود'' میں ہے کہ ابتدائے حاضری سے فراغ تک حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس میرے اسباق رہے جن میں حمد اللہ علی میر زاہد، رسالہ میر زاہد علی ملا جلال اور فقہ میں ہدایہ اخرین اور حدیث کی متعدد کتب پڑھیں جن کی تفصیل ''سبع سیارہ'' رسالہ میں ہے اور قراءت کی مشق مکّہ مکرمہ کی حاضری پر

شیخ القراء قاری عبداللہ صاحب مہاجر مکّی سے کی، ''اشرف السوانح'' میں تحریر ہے کہ جب مدرسہ صولتیہ کے بالائی حصّہ پر قاری صاحب حضرت تھانوی کو مشق کراتے تو نیچے سے سننے والے کو بسا اوقات استاذ وشاگرد کی آواز میں اشتباہ ہوتا تھا۔ دارالعلوم سے فراغ پر آخر صفر ۱۳۰۱ھ میں مدرسہ فیضِ عام کان پور کی صدر مدرسی پر بمشاہرہ پچیس روپے تشریف لے گئے۔

حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے تھے کہ تعلیم کے زمانے میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ دس روپے تنخواہ کافی سمجھا کرتا تھا، پانچ روپے اپنی ضرورت کے لیے اور پانچ روپے گھر والوں کی ضرورت کے لیے، فیضِ عام میں تشریف لے جانے کے تین چار ماہ بعد مواعظ کی شہرت ہوئی تو اہلِ مدرسہ نے اس پر زور دیا کہ حضرت اپنے مواعظ میں مدرسے کے لیے چندہ بھی کیا کریں جس کو حضرت نے قبول نہیں کیا، اس پر اختلاف ہوا اور حضرت استعفا دے کر چلے آئے، مگر چوں کہ اہلِ کان پور گرویدہ ہو چکے تھے اس لیے جب حضرت واپسی کے لیے اس نیت سے کہ پھر ادھر آنا ہو یا نہ ہو گنج مراد آباد حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہ کی زیارت کے لیے پہنچے اور زیارت وغیرہ کے بعد دوبارہ کان پور سامان لینے کے لیے پہنچے تو حاجی عبدالرحمٰن صاحب نے اپنے محلّہ کی جامع مسجد محلّہ پٹکاپور میں ایک مدرسہ جامع العلوم کے نام سے تجویز کیا اور اس میں باصرار حضرت سے قیام کی درخواست کی۔

چناں چہ پچیس روپے پر حضرت نے وہاں قیام منظور فرمالیا۔ اور جامع العلوم کے قیام کے دوران میں حضرت کو خیال ہوا کہ تنخواہ لے کر دین کی خدمت گو جائز ہے، لیکن جی اس کو پسند نہ کرتا تھا، اس لیے کچھ دنوں بعد دہلی جا کر حکیم عبدالمجید صاحب سے طب کی تعلیم شروع کی، تاکہ گزر اوقات مطب سے ہو اور خدمتِ دین لوجہ اللہ تعالیٰ، لیکن حضرت کے دہلی جانے پر اہلِ کان پور مضطربانہ دہلی پہنچے اور واپسی پر اصرار کیا۔ دہلی کے دوران قیام میں حضرت کے ہم سبق جناب الحاج حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی نور اللہ مرقدہ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ طب کا مشغلہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے کہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مطب کے ساتھ دین اور علمِ دین کی خدمت نہیں ہوتی۔ (از زکریا عفی عنہ: حضرت اقدس قطب الارشاد حضرت گنگوہی کا مشہور

مقولہ ہے کہ جسے دنیا سے کھونا ہو کسی خانقاہ میں بٹھا دو، اور علمِ دین سے کھونا ہو تو علمِ طب پڑھا دے اور دونوں سے کھونا ہو تو شاعری سکھا دے)

حضرت حکیم الامت نے از خود استاذ سے سبق چھوڑ کر واپس آنا خلافِ ادب سمجھا، اس لیے اہل کان پور سے کہا کہ تم استاذ سے خود اجازت لو۔ ان کے اصرار پر حکیم عبدالمجید صاحب نے حکیم الامت سے فرمایا کہ اگر تم ترقی کرنا نہیں چاہتے تو اجازت ہے۔ حضرت تھانوی نے ۱۵ روز دہلی قیام کے بعد کان پور مراجعت فرمائی، حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کو جب مشغلۂ طب چھوڑ کر کان پور مراجعت کی اطلاع ہوئی تو حضرت نے بہت اظہارِ مسرت فرمایا اور فرمایا کہ طبابت کے شغل کو ترک کر کے کان پور آ کر دینیات کے شغل کا حال معلوم ہو کر بے حد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات میں برکت فرما دے۔ آپ کے فیوض و برکات سے لوگوں کو بہت مستفیض فرمائے، میں نے آپ کو پہلے ہی مشورہ دیا تھا کہ دین کو خوب مضبوط پکڑنا چاہیے، دنیا خود ہی اچھی صورت میں خدمت کے لیے حاضر رہا کرے گی۔ بہرکیف: آپ لوگ علماء ورثۃ الانبیاء ہیں آپ لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کے لیے پیدا کر کے بڑے درجے عنایت کیے ہیں، پس اپنے مقصود کا خوب خیال رکھنا چاہیے۔ (مکتوباتِ امدادیہ صفحہ: ۳، مورخہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ)

طالبِ علمی کے آخری دور میں دیوبند کے قیام میں ایک مرتبہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی دیوبند تشریف بری پر بیعت کی درخواست کی تھی، لیکن حضرت قطبِ عالم نے یہ کہہ کر کہ ''طالبِ علمی کے زمانے میں شغلِ باطن مخل تحصیلِ علم ہوگا'' انکار فرما دیا تھا جس کو حضرت تھانوی نے دفع الوقتی پر حمل فرمایا جس کی تفصیل ''یادِ یاراں'' میں مذکور ہے، لیکن اسی زمانہ میں ایک دوسرے طالب علم کو حضرت نے بیعت فرما لیا جس سے حضرت تھانوی کو بہت قلق ہوا۔ اور ۱۲۹۹ھ میں حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہٗ تیسرے سفرِ حج کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت تھانوی نے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے ہاتھ ہی دستی خط حضرت شیخ المشائخ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں لکھا کہ میں نے مولانا سے درخواست بیعت کی تھی مولانا نے انکار کر دیا۔ جناب

سفارش فرمادیں۔ اور اعلیٰ حضرت کی حضرت قطب عالم سے جو گفتگو ہوئی وہ تو معلوم نہیں، لیکن حضرت تھانوی کے خط کا جو جواب حضرت شیخ المشائخ نے مرحمت فرمایا تھا اس میں بجائے سفارش کرنے کے خود ہی خط سے بیعت فرمالیا۔

اور اس سے بہت قبل حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ نے حضرت حکیم الامت کے والد کو ایک خط لکھا تھا کہ جب تم حج کو آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو ساتھ لے کر آنا، حالاں کہ حضرت شیخ العرب والعجم کو اس وقت حضرت تھانوی سے کوئی خصوصی تعارف بھی نہ تھا، خط سے بیعت کے بعد من جانب اللہ حاضری کی صورت بھی پیدا ہوئی، وہ یہ کہ اس زمانے میں دیوبند میں کوئی کمپنی قائم ہوئی تھی۔ جس میں فی حصہ پانچ سو روپے کا تھا اور ایک شخص کو ایک حصے سے زائد لینے کا حق نہ تھا۔ مگر حضرت تھانوی کے والد صاحب نے اپنے تمول کی وجہ سے تین حصے اس طرح لیے: ایک اپنے نام سے، دوسرا حضرت تھانوی کے نام سے اور تیسرا حضرت کے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی کے نام سے اور کچھ عرصہ بعد بعض وجوہ سے اس رقم کو واپس لے لیا۔ اس پر حضرت تھانوی نے اپنے والد صاحب کو لکھا کہ جو حصہ آپ نے میرے نام سے جمع کیا تھا اور اب واپس لے لیا وہ میری ملک ہے یا آپ کی؟ اس پر والد صاحب نے جواب دیا کہ اب تک تو میری ملک تھی اور مصلحتاً تمہارا نام لکھا تھا لیکن اب تمہاری ملک ہے۔ اس پر حضرت تھانوی نے لکھا: اب تو اس رقم کی زکاۃ بھی مجھ پر واجب ہے اور اس کی وجہ سے مجھ پر حج بھی فرض ہوگیا۔ والد صاحب نے زکاۃ کی رقم تو نقد بھیج دی اور حج کے متعلق لکھا کہ میں تمہاری چھوٹی بہن یعنی والدہ ماجدہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی (شیخ الاسلام پاکستان) کے نکاح سے فارغ ہو جاؤں تو آئندہ سال حج کے لیے جاؤں گا، اس وقت تم بھی ساتھ چلنا۔

حضرت تھانوی نے لکھا: (اگرچہ والد کا ادب بھی بہت کرتے تھے اور ڈرتے بھی بہت تھے) آپ مجھے یہ لکھ دیجیے کہ تو آئندہ سال تک زندہ رہے گا۔ اس پر والد صاحب نے لکھا کہ یہ میں کیسے لکھ سکتا ہوں تو حضرت تھانوی نے لکھا کہ پھر حج کو کیسے مؤخر کر سکتا ہوں؟ اس پر والد صاحب نے بہت ہی عجلت کی حالت میں شوال ۱۳۰۱ھ میں نہایت عجلت میں اپنی صاحب

زادی کا کھڑے کھڑے نکاح پڑھ دیا اور شادی کی تقریبات سے فراغت بھی نہیں ہوئی تھی کہ حضرت تھانوی کے ساتھ حج کو روانہ ہوگئے، جب کہ حضرت تھانوی قدس سرہ کو کانپور کی ملازمت کو چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس سال دریا میں طغیانی بہت شدت سے تھی۔ راستہ میں والد صاحب کے دوستوں نے طغیانی سے ڈرایا بھی، مگر والد صاحب نے فرمایا کہ اب تو ارادہ کرلیا ہے۔ واقعی سمندر میں بہت زیادہ طغیانی تھی اور حضرت کا جہاز حیدری نام بہت چھوٹا جہاز تھا جو طغیانی کا تحمل نہیں کرسکتا تھا۔ کبھی ادھر جھکتا کبھی ادھر۔ موج کا پانی جہاز کے اوپر کو گزرتا اور سب سامان کو بھگو دیتا، لیکن اللہ کے فضل سے نہایت عافیت کے ساتھ مکّہ مکرمہ پہنچ گئے۔ حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ جب اول بار بیت اللہ پر نظر پڑی ہے تو اس طرح کیفیت انجذابیہ شوقیہ ہوئی کہ پھر عمر بھر بھی کبھی نہیں ہوئی۔ اعلیٰ حضرت مہاجر مکیؒ کو بھی حضرت کی حاضری پر نہایت مسرت ہوئی اور ارشاد فرمایا کہ تم چھ ماہ میرے پاس رہ جاؤ۔ لیکن والد نے مفارقت گوارا نہ کی تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ اب تو والد کی اطاعت کرو پھر کبھی موقع ہوا تو چھ ماہ آکر رہ جانا۔

اس سفر میں تجدیدِ بیعت دست بدست بھی ہوگئی اور حضرت حکیم الامت کے والد بھی اسی سفر میں مشرف بہ بیعت ہوئے۔ باوجود اعلیٰ حضرت کی خواہش کے والد صاحب نے مفارقت گوارا نہ کی اس لیے واپس آنا پڑا لیکن باوجود یہ کہ حجاز سے واپسی پر جامع العلوم کان پور میں درس وتدریس کا سلسلہ چلتا رہا، لیکن دن بدن طبیعت پر علومِ باطنی کی طرف میلان بڑھتا رہا اور ۱۳۰۷ھ میں ذکر و شغل کی طرف جب زیادہ میلان بڑھ گیا تو حضرت حاجی صاحب سے ترکِ ملازمت کی اجازت چاہی، لیکن حاجی صاحب نے منظور نہیں فرمایا جو مفصل تو ''مکتوباتِ امدادیہ'' میں ہے اور مختصر ''اشرف السوانح'' میں صفحہ: ۱۷۳ پر فارسی میں بھی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے ''ذوق وشوق کے حالات سے ترقی کا اندازہ ہوا، البتہ ملازمت کا ترکِ تعلق مناسب نہیں کہ یہ تجردانہ زندگی کے مناسب ہے۔ اہل وعیال کو مضطرب چھوڑنا ناعاقبت اندیشی ہے۔ یہ والا نامہ ۲۲ محرم ۱۳۰۸ھ کا ہے، اسی ذوق وشوق میں حضرت حاجی صاحب کی

خدمت میں حاضری کے عرائض بار بار لکھے اور چوں کہ ۱۳۰۵ھ میں والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے اجازت کا مسئلہ بھی نہ تھا۔ ۱۳۱۰ھ کے آخر میں حج کے لیے روانہ ہوئے اور اعلیٰ حضرت کی تمنا کہ ''چھ ماہ میرے پاس رہو'' کو پورا کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔

وہاں جانے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ایسے منظورِ نظر بنے کہ لوگوں کو رشک ہی نہیں حسد ہونے لگا، یہاں تک کہ حضرت تھانوی خود فرمایا کرتے تھے کہ میں یہ چاہا کرتا تھا کہ حضرت میرے اوپر سب کے سامنے اتنی شفقت نہ فرمایا کریں تو اچھا ہے۔ آخر میں حضرت تھانوی کو حاسدین سے اتنا اندیشہ ہوگیا تھا کہ پورے چھ ماہ کا ارادہ پورا نہ ہوسکا اور ہفتہ عشرہ پہلے ہی تشریف لے آئے کہ ابھی تو میں حضرت کے یہاں مقبول ہوں آیندہ کہیں لگائی بجھائی کرنے والے حاسدین حضرت کو میری طرف سے مکدر نہ کردیں۔ اس لیے انشراح کی حالت میں ہی رخصت ہو جانا چاہیے اور اسی سفر میں اعلیٰ حضرت کی طرف سے اجازتِ بیعت بھی حاصل ہوگئی۔ واپسی پر اپنے مشغلہ علمیّہ میں مشغول رہے۔

اسی دوران میں حضرت کے ماموں پیر جی امداد علی جو عرصہ سے حیدر آباد میں مقیم تھے اور نہایت مغلوب الحال والمقال حیدر آباد سے واپسی میں کان پور کو قصداً اس تمنا میں گزرے کہ بھانجے کو بھی جن کا شہرہ سن رہے تھے ملاقات کروں، وہ کان پور میں آکر سرائے میں ٹھہرے اور حضرت کو اطلاع دی کہ اگر تم اپنی وضع کے خلاف نہ سمجھو تو مجھ سے سرائے میں آکر مل جاؤ۔ حضرت ملنے تشریف لے گئے اور باصرار اپنے مکان پر لے آئے۔ ماموں صاحب نے فرمایا بھی کہ میاں تم عالم باعمل ہو، مجھے اپنے یہاں نہ لے جاؤ کہ دیکھنے والے یہ کہیں گے کہ کس لچے کو لے آئے، مگر حضرت کے اصرار پر پیر جی صاحب مع اپنے ساز و سامان کے جس میں آلاتِ سماع بھی تھے مکان پر آگئے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ماموں صاحب میں اتنی سوزش تھی کہ کلمات سے آگ سی نکلا کرتی تھی، جس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک جوش پیدا ہوا کہ جس طرح بھی ہو ان سے عشق کی آگ لی جائے اور بے اختیار ماموں صاحب کی طرف رجوع کرلیا۔

حضرت تھانوی کا یہ رجوع دوسری مرتبہ تھا، پہلی مرتبہ سفرِ حج ثانی ۱۰ھ سفرِ اجازتِ بیعت

سے پہلے کا ہے۔ اس کا بیان ''اشرف السوانح'' صفحہ: ۲۱۵ پر ہے۔ بعض حضرت تھانوی کے سوانح لکھنے والوں نے دونوں کو خلط کر دیا۔ اسی دوسرے رجوع پر حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کی وہ خط وکتابت ہے جو ''تذکرۃ الرشید'' میں مفصّل موجود ہے۔ حضرت تھانوی کے اس رجوع پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا منور علی صاحب کے واسطے سے حضرت تھانوی سے شکوہ کیا۔ جس کا مختصر ذکر ''یادِ یاراں'' میں بھی ہے۔ ''اشرف السوانح'' میں تو یہ قصّہ بہت مختصر ہے اور خط کی طرف صرف اشارہ ہے، لیکن ''تذکرۃ الرشید'' صفحہ ۱۱۴ جلد اول پر یہ تذکرہ حضرت گنگوہی وحضرت تھانوی کی مکرر سہ کرر مراسلت کے ذیل میں مذکور ہے۔ البتہ ''اشرف السوانح'' کی ترتیب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ وہنگامہ حضرت تھانوی کے دوسرے سفرِ حج اور اجازت سے قبل کا ہے، لیکن ''تذکرۃ الرشید'' میں ان خطوط پر جو تاریخیں درج ہیں ان میں حضرت تھانوی کے سب سے پہلے خط پر ۲۹رذیقعدہ ۱۳۱۴ھ ہے اور حضرت گنگوہی کے جواب پر ۵ر ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ ہے۔ اسی طرح حضرت تھانوی کا دوسرا عریضہ ۱۳رذی الحجہ ۱۳۱۴ھ کا ہے اور حضرت گنگوہی کا جواب ۵رمحرم الحرام کا ہے۔ اور تیسرا عریضہ حضرت تھانوی کا ۸رمحرم ۱۳۱۵ھ کا ہے اور اس پر حضرت گنگوہی کا جواب ۱۲رمحرم ۱۳۱۵ھ کا ہے، اس کے بعد کئی مکاتبتیں ہیں، آخری مکاتبت میں حضرت تھانوی کا رجوع اور حضرت گنگوہی کا اس پر تشکر ہے جو بہت طویل خط وکتابت ہے جو ''تذکرۃ الرشید'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

لیکن اس ناکارہ زکریا کے خیال میں ۱۱ھ میں مکّہ مکرمہ سے واپسی پر اعلیٰ حضرت نے جو دو وصیتیں فرمائی تھیں: میاں اشرف علی! ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی عجلت نہ کرنا۔ اور کبھی کان پور کے تعلّق سے دل برداشتہ ہو تو پھر دوسری جگہ تعلّق نہ کرنا (اشرف السوانح: ۲۰۷) توکل بخدا تھانہ بھون جاکر بیٹھ جانا۔ اس سفرِ حج سے واپسی کے بعد سے حضرت کا تبتّل کا میلان تو بڑھتا ہی گیا۔ حضرت تھانوی کا خود ارشاد ہے کہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت سے واپسی کے بعد ایک سال کے قریب میں نے وعظ نہیں کہا، لوگ بہت اصرار کرتے تھے، مگر مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی کہ ایسے خراب شخص سے کیوں وعظ کے لیے کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ بہت اصرار

کیا تو میں رونے لگا، اس کے بعد اصرار نہیں ہوا۔ (حسن العزیز، جلد اول ملفوظ: ۳۰۶ صفحہ: ۱۶۶)

اس دوران میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے ترکِ ملازمت کی دو مرتبہ اجازت بھی چاہی جو مجھے ''تذکرۃ الرشید'' میں یاد ہے، مگر حضرت گنگوہی نے دونوں مرتبہ اجازت نہیں فرمائی اور تیسری مرتبہ حضرت تھانوی نے ترکِ ملازمت کے بعد یہ لکھا کہ حضرت مجھ سے تحمّل نہیں ہوا میں چھوڑ کر چلا آیا تو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے بہت دعائیں دیں۔ میرے والد صاحب حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاتبِ خطوط نے پہلے دو خطوں پر بھی بہت سفارش کی کہ اللہ کا نام ایک شخص توکلا علی اللہ بلا معاوضہ سکھانے کا ارادہ کرتا ہے تو حضرت کیوں منع فرماتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ جو میں کہتا ہوں لکھ دو اور تیسرے جب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے بہت دعائیں دیں تو میرے والد صاحب نے پھر عرض کیا کہ پہلے دو خطوں میں تو حضرت نے یہ لکھوایا تھا اور اب اظہارِ مسرت کیا؟ تو حضرت نے فرمایا کہ آدمی مشورہ جب کیا کرتا ہے جب تردد ہو۔ اور جب تک تردد ہو توکل ٹھیک نہیں۔ یہ قصّہ میں نے بڑی تفصیل سے اپنے والد صاحب سے بھی سنا تھا اور ''تذکرۃ الرشید'' میں بھی یاد ہے، مگر اس وقت مراجعت دشوار ہے۔

بہر حال! حضرت حکیم الامت اوائل ۱۳۱۵ھ میں کان پور سے ترکِ ملازمت کر کے تھانہ بھون تشریف لائے جس کی تفصیل ''اشرف السوانح'' صفحہ: ۲۲۹ پر ہے۔ تھانہ بھون تشریف آوری کے بعد حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ پر کچھ قرضہ ہوا، جس کی دعا کے لیے اعلیٰ حضرت کو مکّہ مکرمہ اور قطب الارشاد کو گنگوہ لکھا۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کا جواب تو یہ آیا کہ آپ کی استقامت اور توکل میں کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ (مختصر مکتوب ۳۷، ۶ رجب ۱۳۱۵ھ) اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا کہ اگر کہو تو مدرسہ دیوبند میں تمہارے لیے مدرسی کی تحریک کروں؟ اس پر حضرت تھانوی نے عرض کیا کہ میرا تو عرض کرنے کا مقصد صرف دعا ہے، باقی حضرت حاجی صاحب نے بعد ترکِ تعلّق کان پور کسی اور جگہ کوئی تعلّق کرنے کی ممانعت فرما دی ہے، لیکن اگر حضرت کی یہی تجویز ہے تو میں اس کو بھی حضرت حاجی صاحب ہی کی تجویز سمجھوں گا اور یہ سمجھوں گا کہ حضرت حاجی صاحب ہی نے اپنی پچھلی تجویز کو منسوخ فرما کر اب یہ صورت تجویز

فرمادی ہے۔ یہ سن کر حضرت مولانا گنگوہی نے فوراً گھبرائے ہوئے سے لہجہ میں فرمایا کہ نہیں نہیں! اگر حضرت حاجی صاحب کی ممانعت ہے تو میں ہرگز اس کے خلاف مشورہ نہیں دیتا، میں دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ قرض سے سبکدوش فرمائے، چناں چہ دونوں حضرات کی دعا کی برکت سے قرضہ سے جلدی سبکدوشی ہوگئی اور پھر بفضلہٖ تعالیٰ کبھی تنگی نہیں ہوئی (اشرف السوانح: ۲۳۵)

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے دو نکاح ہوئے۔ پہلا طالبِ علمی کے دوران میں جس کو حضرت تھانوی نے ''یادِ یاراں'' میں اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ جب احقر کا گنگوہ میں نکاح ہوا غالباً ۱۲۹۸ھ تھا، والد صاحب مرحوم کی درخواست پر شیخ غلام محی الدین مرحوم رئیس اعظم چھاؤنی میرٹھ کہ والد مرحوم ان کی ریاست میں مختار تھے، والد صاحب کی درخواست پر انھوں نے نکاح میں شرکت کی، نکاح حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے پڑھا تھا۔ جب حضرت قدس سرہٗ مجلسِ نکاح سے واپس ہوگئے تو شیخ صاحب بھی ساتھ ساتھ چلے گئے۔ شیخ صاحب نے خود مجھ سے ایک دفعہ کہا کہ میں نے بہت سے بزرگ دیکھے، بڑے بڑے حکام سے ملا، لیکن جو رعب وہیبت حضرت کی دیکھی وہ کسی میں نہیں دیکھی۔ یہ حالت تھی کہ بات کرنا چاہتا تھا، مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ ان کی یہ شہادت ایک باوقعت شہادت تھی الخ.

دوسرا نکاح اپنی ہمشیرزادہ مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ برادر بزرگ مولانا ظفر احمد صاحب شیخ الاسلام پاکستان کی بیوہ سے ہوا۔ یہ نکاح وسط رمضان ۳۴ھ میں ابتداءً وکالت کے ذریعہ سے ہوا تھا، لیکن ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے حضرت نور اللہ مرقدہ کو ایک طلاق دینی پڑی اور اس پر اہلیہ اولیٰ نے خود کیرانہ جا کر سب کو ازسرِنو راضی کر کے اور حضرت کو بلا کر تجدیدِ نکاح کی۔ اس میں بھی بڑی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے اس سلسلہ میں ایک مستقل رسالہ بھی ''الخطوب المذيبة للقلوب المنيبة'' تحریر فرمایا۔ وصال کے وقت دونوں اہلیہ حیات تھیں۔ بڑی اہلیہ محترمہ کا چند سال بعد تھانہ بھون میں انتقال ہو چکا، دوسری اہلیہ محترمہ تقسیمِ ہند کے بعد اپنے داماد مفتی جمیل احمد صاحب مفتی جامعہ اشرفیہ کے ساتھ لاہور تشریف لے گئیں جو اس رسالہ کی تالیف تک بقیدِ حیات ہیں۔

حضرت حکیم الامت اصلاح ورشد وہدایت کے ساتھ خانقاہ امدادیہ کی زینت بنے رہے اور سلسلۂ علالت تو کچھ دنوں پہلے سے شروع ہوگیا تھا۔ اور بڑی اہلیہ کی اجازت سے اہلیہ محترمہ صغریٰ کے مکان پر تشریف فرماتھے۔ علالت زور پکڑتی رہی، مختلف علاج تجویز ہوتے رہے کہ ۱۵؍رجب المرجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹؍جولائی ۱۹۴۳ء یوم دوشنبہ کی صبح ہی سے حضرت فرمانے لگے کہ آج ہاتھ پیروں کی جان سی نکل گئی ہے۔ ظہر کے بعد سے سوئے تنفّس پیدا ہوگیا، فرمایا کہ اتنی تکلیف مجھے عمر بھر نہیں ہوئی، لیکن بجائے کراہنے کے لفظِ اللہ درد کے ساتھ زبان سے نکلتا تھا اور دوشنبہ سہ شنبہ کی درمیانی شب میں ساڑھے دس بجے وصال ہوا۔

مولانا شبیر علی صاحب برادر زادہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جن کو حضرت قدس سرہٗ نے گویا متبنی بھی بنا رکھا تھا پیر کی صبح کو سہارن پور دوائیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ نے بار باران کو طلب کیا کہ کچھ معاملات فرمانا چاہتے تھے، مگر مولانا شبیر علی صاحب مرحوم وصال کے بعد پہنچے اوران ہی کی تجویز سے تدفین صبح کے بعد قرار پائی۔ منگل کی صبح نماز سے پہلے سہارن پور آدمی پہنچ گیا اور بھی قرب وجوار میں بجلی کی طرح سے اطلاعیں پہنچ گئیں۔ یہ ناکارہ تو خبر سنتے ہی فوراً اسٹیشن روانہ ہوگیا اور عین گاڑی کی روانگی کے وقت بلکہ چلتی گاڑی میں سوار ہوگیا۔ اور دس بجے کے قریب تھانہ بھون حاضر ہوگیا، لیکن گاڑی کوئی اور تھانہ بھون جانے والی نہیں تھی اس لیے اہلِ شہر کی مساعی سے تھانہ بھون کے لیے دو اسپیشل یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے۔ پہلا اسپیشل تو ۱۲ بجے کے بعد جب کہ جنازہ عیدگاہ میں تدفین کے لیے لایا جاچکا تھا پہنچ گیا تھا اور کچھ لوگ جو جلال آباد کے اسٹیشن سے اتر کر پاپیادہ تھانہ بھون بھاگ گئے تھے وہ تو نماز میں بھی شریک ہوگئے اور جو اسپیشل ہی میں گئے وہ دفن میں تو شریک ہوگئے، مگر جنازہ میں شریک نہ ہوسکے، لیکن دوسرا اسپیشل تدفین کے بعد پہونچا۔ إنا للّٰه وإنا إليه راجعون، للّٰه ما أخذ وله ما أعطى وكل شيء إلى أجل مسمى، كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذو الجلال والإكرام.

۲۹؍ذیقعدہ ۱۳۹۱ھ دوشنبہ

تقریر بخاری شریف (اردو)

از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مد فیوضکم

مرتبہ مولوی محمد شاہد صاحب سہارن پوری

یہ عظیم الشان تقریر کسی تعارف کی محتاج نہیں حضرت قدس اللہ سرہٗ دامت برکاتہم کا درسِ حدیث جو اس عصر کا ایک ممتاز ترین درسِ حدیث ہے، اس کے نچوڑ کو اس تقریر میں بعینہٖ حضرت دامت برکاتہم کے الفاظ میں جمع کیا گیا ہے جس میں سب سے زیادہ اہم حضرت شیخ دامت برکاتہم کی اپنی وہ آرا ہیں جو تراجمِ بخاری پر کلام کے دوران آپ نے پیش فرمائیں، جن سے شروحِ کتبِ حدیث خالی ہیں۔ ائمہ اربعہ کے اختلاف کو احادیثِ متعارضہ کے درمیان جمع کو مختصر اور جامع الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ (زیرِ طبع)

عربی میں شروحِ حدیث کا بہترین ذخیرہ

بذل المجهود في حل أبي داود: کامل در پانچ جلد مؤلفہ حضرت شیخ المشائخ قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین فخر المحدثین حضرت اقدس مولانا الحاج خلیل احمد السہارنفوری ثم المہاجر المدنی، یہ ابوداود کی نہایت ہی جامع اور مکمل شرح ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے جیسا کہ بعض مشائخ کی رائے ہے کہ یہ صرف ابوداود کی شرح نہیں بلکہ اکثر کتبِ حدیث کی شرح ہے تو بے محل نہیں ہوگا، اس لیے کہ اس مبارک کتاب میں دوسری کتبِ حدیث کے متعلق اشکالات، جوابات اور ان کی روایات پر بھی اکثر کلام کیا گیا ہے، خصوصاً حنفیہ کے دلائل کو اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے، اور ان روایات کی توجیہ کی گئی ہے جو بظاہر مسلکِ حنفیہ کے خلاف ہیں، نیز تحقیقاتِ عجیبہ ونکاتِ لطیفہ پر مشتمل ہے۔ بالخصوص حضرت امام ابوداود کے اپنے اقوال یا اسانید کے اغلاق کا بہترین حل جو دوسری شروح میں نہیں ملتا اس مبارک شرح میں تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ یہ کتاب عرصہ ہوا طبع ہوئی تھی، مگر سب جلدیں ختم ہوگئیں، البتہ

صرف پہلی جلد کتب خانہ یحیوی مظاہر العلوم سہارن پور سے بقیمت پچیس[1] روپے مل سکتی ہے۔ اور معلوم ہوا ہے کہ پاکستان میں پتا ذیل پر اس کی طباعت شروع ہوگئی ہے اور پہلی و دوسری جلد طبع بھی ہوگئی، بقیہ جلدیں زیرِ طبع ہیں۔ پتا حسبِ ذیل ہے: ''مکتبہ قاسمیہ ملتان'' اور ندوہ میں ٹائپ پر بھی اس کی طباعت شروع ہوگئی ہے۔

لامع الدراري على جامع البخاري: یہ اعلیٰ حضرت قطب الارشاد امیر المومنین فی الحدیث العارف باللہ حضرت الحاج مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کی وہ تقریریں ہیں جو حضرت قدس سرہٗ نے ''بخاری شریف'' پڑھاتے ہوئے اردو زبان میں فرمائی تھیں اور ان کے شاگرد رشید الادیب الاریب حافظ القرآن والحدیث مولانا محمد یحییٰ صاحب نے حضرت استاد کی ان تقاریر کو پڑھنے کے زمانے میں عربی میں نقل کیا تھا اور شیخ الحدیث صاحب دامت مجدہم نے ان کو اپنے بہترین قیمتی حواشی کے ساتھ مزین فرما کر طبع کرایا ہے۔ اس تالیف میں خاص طور پر امام بخاری کے تراجم کی اغراض اور احادیث کی مطابقت پر وضاحت سے کلام کیا گیا ہے اور ایسی تحقیقات نادرہ بھی کی گئی ہیں جو دوسری شروح میں نہیں، یہ شرح تین مجلدات میں ہے، ۴/ ۱۷×۲۷ سائز پر اعلیٰ کتابت عمدہ طباعت کے ساتھ اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ جلدِ اول ۳۶۸ صفحات پر ہے، اس کے شروع میں ۱۵۲ صفحات کا مقدمہ بھی ہے۔ قیمت جلد اول مع مقدمہ پچیس روپے۔ اس کا مقدمہ غایتِ افادیت کی وجہ سے کہ اس میں امام بخاری کے اصولِ تراجم پر نہایت تحقیق و تفصیل سے کلام کیا گیا ہے جن کا عدد ستر تک ہوگیا اور شروحِ بخاری پر بھی مبسوط کلام کیا گیا ہے، علیحدہ بھی طبع کیا گیا ہے جس کی قیمت پانچ روپے ہے اور مولانا الحاج ابوالحسن علی صاحب ناظم ندوۃ العلما لکھنو نے اپنی تقدیم کے ساتھ ٹائپ پر بھی اس کو طبع کرایا ہے، قیمت بیس روپے صفحات جلدِ ثانی ۵۲۶، قیمت پچیس روپے۔

---

[1] واضح رہے کہ کتابوں کے تعارف میں درج جلد، سائز، صفحات اور قیمتوں کا تعلق اس وقت سے ہے جب یہ تعارفی مضمون چھپا تھا۔ وقت اور حالات کی تبدیلی سے ان کتابوں کی جلدوں، سائز، صفحات اور قیمتوں میں تبدیلی ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی یہ امکان برقرار رہے گا۔

الکوکب الدری: یہ بھی ان بیش بہا افادات کا مجموعہ ہے جو قطبِ عالم گنگوہی نے درسِ ترمذی شریف کے وقت فرمائے تھے اور حضرت اقدس مولانا محمد یحییٰ صاحب نور اللہ مرقدہ نے عربی میں ان کو قلم بند فرمایا تھا۔ ان کی افادیت تو اس سے ظاہر ہے کہ کبار مشائخ نے طبع ہونے سے پہلے ہی اس کی مختلف نقلیں کرائی ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم نے اپنے بیش قیمت حواشی سے اس پر چار چاند لگا دیے ہیں۔ ۸/ ۲۰×۲۶ سائز پر دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، قیمت جلد اول: ۱۲، جلد ثانی: ۸۔

أوجز المسالك شرح موطأ امام مالك: موطأ امام مالک کو جو مرتبہ کتبِ حدیث میں حاصل ہے وہ اہلِ علم پر مخفی نہیں، تمام مدارس میں زیرِ درس ہے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب دام مجدہ نے اس کی مفصل اور نہایت مبسوط شرح چھ جلدوں میں تصنیف فرمائی ہے، جس میں خاص طور سے امورِ ذیل کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کلمات غریبہ اور مفردات کا حل، رواۃ کی تحقیق، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کی تشریح وتوضیح اور کتبِ مالکیہ سے ان کی تائیدات ایسے طور پر کی گئی ہیں کہ جس سے امام مالک کے اقوال کی غرض واضح ہو جاتی ہے۔ ائمہ اربعہ کے مذاہب ان کی فقہی کتب سے نقل کیے گئے ہیں۔ خاص طور سے مذہبِ حنفی کے دلائل کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ قیمت کامل چھ جلد مع مقدمہ ایک سو پانچ روپے، اس کا مقدمہ بھی اپنی غایتِ افادیت کی وجہ سے لیتھو پر مستقل بھی طبع کیا گیا تھا، جس کی قیمت تین روپے تھی اور ٹائپ پر مولانا ابوالحسن علی صاحب نے اپنی تقدیم کے ساتھ بہت آب وتاب سے شائع کرایا ہے قیمت: ۱۲۔

جزء حجة الوداع والعمرات: یہ رسالہ حضرت شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم نے اپنی ابتدائے مدرسی ۱۳۴۳ھ میں ایک دن ڈیڑھ رات میں لکھا تھا، جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ حج کے قصے کو مسلسل متن بنایا ہے اور اس کے متعلق اختلاف روایات، ائمہ اربعہ کے مذاہب اور مختلف روایات میں جمع کی طرف اشارے بھی کیے گئے ہیں اور مجمل روایات کا محمل بتایا گیا ہے اور بہت سے ایسے واقعات میں احکام کی تعیین کی گئی ہے جس سے عام طور سے شراح نے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔ تالیف کے بعد سے اکابر مدرسینِ حدیث کتاب الحج

پڑھاتے وقت اس رسالہ کو زیرِ نظر رکھتے تھے۔ بہت سی مرتبہ بعض دوستوں نے اس کی طباعت کا مشورہ دیا، مگر حضرت شیخ نے یہ کہہ کر انکار فرمادیا کہ یہ مجمل اشارات ہیں طباعت کے لیے نہیں ہیں، بلکہ بطور یادداشت کے ہیں، لیکن ۸۹ھ میں مدینہ پاک کے قیام میں بلاکسی سبب کے اس کا داعیہ پیدا ہوا اور مدینہ پاک سے واپسی پر ذی قعدہ ۸۹ھ میں اس کا از سرِ نو سننا شروع کیا، جس میں کئی ماہ لگ گئے اور اس کے اختتام پر شیخ نے خواب دیکھا کہ اس میں حضور کے عمروں کا ذکر ضرور ہونا چاہیے، اس پر حضور کے عمروں کا ذکر بھی از سرِ نو تالیف کیا گیا ہے، یہ کتاب لیتھو میں ۸/ ۲۳× ۲۹ سائز پر طبع کی گئی ہے۔ صفحات ۱۲۰، قیمت تین روپے۔ یہ رسالہ مولانا الحاج ابوالحسن علی صاحب کی مساعی سے ندوۃ العلماء کے ٹائپ پر بھی طبع ہوا ہے، قیمت پندرہ روپے۔

الأبواب والتراجم للبخاري: یہ کتاب درحقیقت شراحِ بخاری اور اپنے اکابر کی تحقیقات کا گل دستہ ہے۔ امام موصوف کے تراجمِ ابواب کی باریک بینی اور دقتِ نظر پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ ابواب واحادیث وآثار کے درمیان مناسبت تامہ کا مرقع مدراس عربیہ کے علما وفضلا اور مدرسینِ حدیث کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے، یعنی حضرت علامہ محدث شہیر الحاج مولانا محمد زکریا صاحب مدفیوضہم العالیۃ جنھوں نے تقریباً نصف صدی تک ''بخاری شریف'' کا درس دیا ہے، اپنے اثنائے مطالعہ میں شراح بخاری اور اپنے اکابر بالخصوص حضرت قطب الارشاد گنگوہی اور محدث کبیر حضرت مولانا سہارن پوری کی تحقیقات وآرا جو تراجم بخاری سے متعلق تھیں ان کو قلم بند فرماتے رہے اور ان حضرات کے کلام میں غور وفکر اور اپنی ذاتی تحقیق وتنقیح کے بعد اصولِ بخاری کی تعداد ستر تک بیان فرمائی اور ان اصولوں کی روشنی میں تراجمِ ابواب اور احادیث وآثار کے درمیان اس طرح مناسبت کو بیان فرمایا ہے کہ پوری کتاب انتہائی مرتب نظر آتی ہے اور ہر باب میں امام موصوف کی باریک بینی ودقتِ نظر اور استنباط واستخراج کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کی جلد اول ٹائپ اور لیتھو دونوں پر طبع ہوچکی ہے۔ قیمت مطبوعہ لیتھو ایک روپیہ پچاس پیسے، قیمت مطبوعہ ٹائپ چھ روپے۔

ملنے کا پتہ: کتب خانہ یحیوی متصل مظاہر علوم سہارن پور۔

اردو تصانیف حضرت شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم

خصائل نبوی اردو ترجمہ شمائل ترمذی: چوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ اور عاداتِ شریفہ کی خود حق سبحانہ وتقدس نے تعریف فرمائی ہے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات میں حدیث کی مشہور ومعروف کتاب ''شمائلِ ترمذی'' کا اردو ترجمہ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ العالی نے بڑے دلچسپ انداز میں فرمایا ہے۔ قیمت چھ روپے۔

فضائلِ قرآن: جس میں قرآن پاک کے فضائل میں چالیس احادیث مع ترجمہ وشرح، اس کے بعد سات احادیث متفرق احکامِ قرآن میں اور بعد میں ایک چہل حدیث نہایت مختصر ایک صفحہ کی تحریر کی گئی ہے، تاکہ اس مختصر حدیث کو یاد کرنے سے چہل حدیث کے حفظ کرنے کے فضائل آسانی سے حاصل ہو جائیں۔ قیمت پچھتر پیسے۔

حکایاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم: جو حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہ رائے پوری کے تعمیلِ ارشاد میں لکھی گئی ہے۔ اس میں صحابی مردوں، صحابی عورتوں اور بچوں کے زہد وتقوی، فقر وعبادت، علمی مشاغل، ایثار وہمدردی، بے مثل جرأت وبہادری، حیرت انگیز جاں نثاری وغیرہ وغیرہ کے ایمان افروز حالات درج ہیں۔ اس میں بارہ باب ہیں:

باب اول: دین کی خاطر سختیوں کے برداشت کرتے میں۔

باب دوم: اللہ تعالیٰ کا خوف۔

باب سوم: صحابہ کا زہد وفقر۔

باب چہارم: صحابہ کا تقوی۔

باب پنجم: نماز کا شوق۔

باب ششم: ایثار وہمدردی اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

باب ہفتم: دلیری اور بہادری اور موت کا شوق۔

باب ہشتم: علمی ولولہ۔

باب نہم: حضور کی فرماں برداری اور امتثالِ حکم۔

باب دہم: عورتوں کا دینی جذبہ۔

باب یازدہم: بچوں کا دینی جذبہ۔

باب دوازدہم: حضور کے ساتھ صحابہ کی محبت۔

اور آخر میں ایک خاتمہ ہے جس میں صحابہ کرام کے اجمالی فضائل اور ان کے ساتھ امت کو کیسا برتاؤ رکھنا چاہیے۔ قیمت دو روپے۔

قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم: یہ رسالہ ایک مکتوب ہے حضرت شیخ کا جو ممبرانِ اسمبلی اور حکام کے نام لکھا گیا تھا، جس میں جبریہ تعلیم سے قرآن پاک پڑھنے والوں کو جو نقصان پہنچتا ہے اس پر تنبیہ کی گئی ہے۔ مسلمان حکام اور ممبرانِ اسمبلی کو اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ قرآن پاک کی حفاظت ہر مسلمان کا انتہائی فریضہ ہے اس میں قلمے قدمے جو کوشش ہو سکتی ہو دریغ نہ فرماویں اور کوئی ایسی تقریر وتحریر نہ ہو جس سے قرآن پاک کی تعلیم میں رکاوٹ ہوتی ہو کہ دنیا کی زندگی بہت کم ہے اور آخرت کی زندگی کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ قیمت چالیس پیسے۔

فضائلِ نماز: اس میں وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جن میں نماز پڑھنے کی فضیلت، نماز چھوڑنے کا عذاب، جماعت کا ثواب اور اس کے ترک کی سزائیں اور نماز میں خشوع وخضوع کے واقعات ہیں۔ ہر مضمون کے مناسب بزرگوں کے شوق وذوق کی حکایات بھی درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ۔

فضائلِ ذکر: جس میں حضرت مولانا الحاج مولانا الیاس صاحب بانیٔ جماعتِ تبلیغ کے ارشاد سے وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جس میں ذکر کی برکات، کلمہ طیّبہ کے فضائل اور سوم کلمہ یعنی تسبیحاتِ فاطمہ کے ثواب وارد ہوئے ہیں۔ خاتمہ میں صلاۃ التسبیح کا مفصّل بیان اور اس کی فضیلت اور اس کے پڑھنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

فضائلِ رمضان: اس میں تین فصلیں ہیں اور ایک خاتمہ، فصلِ اول میں دس احادیث رمضان کے فضائل میں، دوسری میں سات احادیث لیلۃ القدر کے بارے میں اور سورۃ القدر کی تفسیر ہے، تیسری فصل میں تین احادیث اعتکاف کے فضائل میں، خاتمہ میں ایک طویل حدیث ہے جو بہت سے مضامین نماز، لیلۃ القدر، لیلۃ العید سب کا عطر اور خلاصہ پر مشتمل ہے۔ قیمت: ۶۰ پیسے۔

فضائلِ تبلیغ: جو حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہ کے ارشاد سے لکھا گیا۔ اس میں سات فصلیں ہیں:

فصلِ اول: میں قرآن پاک کی آیات سے امر بالمعروف نہی عن المنکر کے فضائل اور ان کا حکم۔

فصلِ ثانی: میں ان ہی مضامین کی احادیث اور۔

فصلِ ثالث: میں تنبیہ ہے اصلاحِ نفس پر۔

فصلِ رابع: میں فضائل اکرام مسلم و وعید تحقیر مسلم۔

فصلِ خامس: میں اخلاص و ایمان واحتساب۔

فصلِ سادس: میں تعظیم علمائے کرام و بزرگانِ دین۔

فصلِ سابع: میں اہلِ حق کی پہچان اور ان کی مجالست کی اہمیّت کو بیان کیا گیا ہے۔ قیمت چالیس پیسے۔

فضائلِ صدقات: اس رسالہ کے دو حصّے ہیں، پہلے حصّہ میں پانچ فصلیں ہیں: فصلِ اول میں خرچ کرنے کے بیان میں، دوسری میں بخل کی مذمت، تیسری میں صلہ رحمی، چوتھی میں زکوٰۃ دینے کی تاکید، پانچویں میں زکوٰۃ نہ دینے پر وعیدیں۔ اور دوسرا حصّہ دو فصلوں پر مشتمل ہے: فصلِ اول میں زہد وقناعت اور فصلِ ثانی میں زاہدوں اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے والوں کی ستر حکایات درج کی گئی ہیں۔ قیمت حصّہ اول تین روپے، حصّہ دوم چار روپے۔

فضائلِ حج: اس میں دس فصلیں ہیں:

فصلِ اول: حج کی ترغیب میں۔

دوسری فصل: حج نہ کرنے پر وعید میں۔

تیسری فصل: سفر کی مشقت کے تحمّل میں۔
چوتھی فصل: حج کی حقیقت میں۔
پانچویں فصل: حج کے آداب میں۔
چھٹی فصل: مکّہ مکرمہ اور کعبہ کے فضائل میں۔
ساتویں فصل: عمرے کے فضائل میں۔
آٹھویں فصل: زیارتِ مدینہ طیّبہ میں۔
نویں فصل: آداب زیارت میں۔اور
دسویں فصل: مدینہ طیّبہ کے فضائل میں ہے۔ قیمت چار روپے۔

فضائل درود شریف: جس میں پانچ فصلیں ہیں:
فصل اول: درود شریف کے فضائل۔
دوسری فصل: خاص خاص درودوں کے خاص فضائل میں۔
تیسری فصل: میں درود شریف کے ترک پر وعیدیں۔
چوتھی فصل: فوائدِ متفرقہ کے بیان میں۔
پانچویں فصل: درود شریف کے متعلق پچاس حکایات میں ہیں۔
نیز روضہ اقدس پر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا طریقہ بھی اس میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچھتر پیسے۔

الاعتدال: حضرت شیخ الحدیث صاحب کا وہ اہم مکتوب جس میں سیاسی مسائل کے متعلق سات سوالات کا جواب نہایت متانت، اعتدال اور تفصیل سے لکھا گیا ہیں، جس میں افراط وتفریط سے بچنے کی نہایت تاکید کی گئی ہے۔

سوال: حضرت حکیم الامت اور حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہما کے درمیان باوجود دونوں کے اہلِ حق ہونے کے، لیگ وکانگریس میں اتنا اختلاف کیوں ہے؟
۲۔ تیرے نزدیک ان دونوں میں سے کون حق پر ہے؟

۳۔ ہمیں ان دونوں میں سے کس کا اتباع کرنا چاہیے؟
۴۔ مسلمان تباہ ہوتے جارہے ہیں آخران کو کیا کرنا چاہیے؟
۵۔ آج کل ہر شخص اہل غرض ہے اپنی غرض کے پیچھے چلتا ہے؟
۶۔ علما کا وقار عمداً گرایا جا رہا ہے۔
۷۔ علما کے اختلاف سے بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔

اس کتاب کا اہل حق کے آپس کے اختلاف کے زمانہ میں مطالعہ بہت ہی ضروری ہے۔ قیمت پانچ روپے۔

آپ بیتی: یہ کوئی مستقل تالیف نہیں تھی، بلکہ مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں نے ''سوانحِ یوسفی'' مصنّفہ مولوی سید محمد ثانی حسنی میں ایک باب اپنے قلم سے حضرت شیخ الحدیث صاحب کے متعلق لکھا، اس کی طباعت پر حضرت شیخ نے ایک تنقید مفصّل مولوی محمد ثانی کو لکھی کہ جو چیزیں اس سیاہ کار کے متعلق لکھنے کی تھیں وہ تو آپ نے چھوڑ دیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں، اور اس سلسلہ کی اپنی ابتدائی تربیت کے چند واقعات لکھے تھے۔ اس کے بعد محرم ۹۰ھ میں جب آنکھ بنوانے کے لیے علی گڑھ جانا ہوا تو آنکھ بند کیے ہوئے اسی سلسلہ کے کچھ اور واقعات دوستوں کے استفسار پر لکھوانے شروع کیے جو اندازے سے زیادہ طویل ہوگئے۔ اس لیے ان کو آٹھ بابوں پر تقسیم کر کے آپ بیتی کا جز بنا دیا گیا۔ آپ بیتی ۲، باب اول: زمانہ طفولیت اور طلب علم، باب دوم: زمانہ تدریس و تالیف۔ ۳ میں، باب سوم: حضرت شیخ کی خصوصی عادات، باب چہارم: حوادث و شادیاں۔ ۴ میں، باب پنجم: التحدیث بالنعمة ، باب ششم: جملہ جوں کی تفصیل۔ ۵ میں، باب ہفتم: تقسیم ہند اور باب ہشتم: متفرقات۔ قیمت آپ بیتی ۱: چالیس پیسے، آپ بیتی ۲: ۲/۵۰، آپ بیتی ۳: ۳، آپ بیتی ۴: ۴، آپ بیتی ۵، ۳/۵۰۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ یحیوی مظاہر علوم سہارن پور۔

0302-2534504, 0321-2196170, 0334-2212230, 0314-2676577, 0346-2190910
www.maktaba-tul-bushra.com.pk